www.shibliinternational.com

January 2020 جنوری

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly SADA E SHIBLI Hyderabad

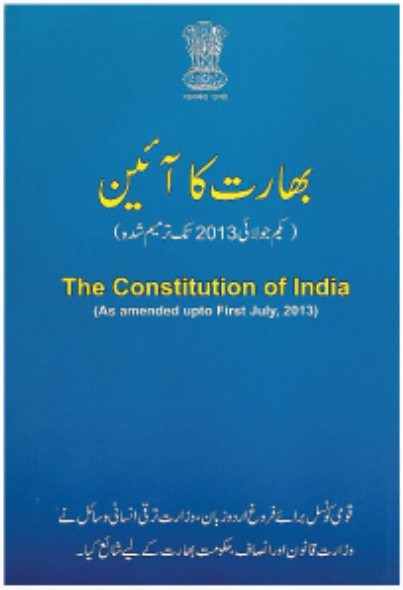

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

جنوری Jan :2020 | علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی، سماجی اور معلوماتی شاہکار | جلد Vol2۔شمارہ: Issue23

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابو ہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامیؔ
پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر
فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، مولانا احمد نور عینی
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابو ہریرہ ایوبی، محسن خان

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661- 8317692718

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
IFSC CODE: IBKL0001327
IDBI BANK, CHARMINAR HYD, TS

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اداریہ	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۱۹)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۱
۵	ڈاکٹر محمد حمید اللہ: امتیازی کارنامے	ڈاکٹر رفیق احمد قاسمی	۱۳
۶	غزل	ڈاکٹر قطب سرشار	۱۷
۷	میرے پیارے ہم وطنوں آؤ دیش بچائیں!	احمد نور عینی	۱۸
۸	ہم دیکھیں گے (نظم)	فیض احمد فیض	۲۰
۹	سائنٹیفک سوسائٹی سرسید احمد خان کی ایک قابل فخر کارنامہ	محمد شاکر	۲۱
۱۰	شاہ کا فرمان (نظم)	ڈاکٹر صابرہ خاتون	۲۴
۱۱	صالحہ صدیقی اور ''ڈرامہ علامہ'' کا ایک تجزیاتی مطالعہ	اویس احمد بٹ	۲۵
۱۲	کیفی اعظمی: ترقی پسند و دیگر ناقدین کی نظر میں	عابد حسین گنائی	۳۱
۱۳	غزل	خوشنما	۳۵
۱۴	قومی یکجہتی کے علمبردار نظیر اکبرآبادی	شگفتہ	۳۶
۱۵	یوم جمہوریت (نظم)	نشور واحدی	۳۸
۱۶	غزل	ظہور ظہیر آبادی	۳۸
۱۷	ساحلوں کے شہر میں (تبصرہ)	مبصر: وصیل خان	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیر الدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبد الماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبد القادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمر الدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اداریہ

جنوری ۲۰۲۰ء شروع ہو چکا ہے۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے قارئین کو نئے سال کی مبارکباد دینا بھی گراں گزر رہا ہے اور اسی ماہ کی ۲۶ رجنوری کو جشنِ جمہوریہ کی بھی تاریخ ہے مگر موجودہ حکومت نے دستورِ ہند میں جو دخل اندازی کی ہے، اس سے اس ملک کا ہر سیکولر شہری کشمکش میں مبتلا ہے۔ آج ملک کے کونے کونے میں لہراتا ہوا ترنگا نظر آرہا ہے اور آواز آرہی ہے۔ سی، اے، اے۔ این، آر، سی۔ این، پی، آر کے بلوں کو بلوں میں ڈال دیا جائے۔ احتجاج کی شروعات آسام سے ہوئی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ اور دیگر یونیورسٹیوں کے طالب علموں نے پورے ملک میں اپنے احتجاج سے جمہوریت کی بقا کے لیے انقلابی روح پھونک دی، سخت سردی کے باوجود دہلی کا شاہین باغ ملک کے لیے شاہین بنا ہوا ہے کہ جب تک یہ حکومت اس بل کو واپس نہیں لے گی، تب تک ہم ہٹنے والے نہیں ہیں، ان کی زبان حال کہہ رہی ہے ؎

ہمیں شکوے کا کیا حق جب ہماری ہی حکومت ہے — نہ مسلم کی نہ ہندو کی یہ جمہوری حکومت ہے
یہ اپنا دیس، اپنا راج ہی اپنی حکومت ہے — یہ آزاد و جواہر لعل نہرو کی حکومت ہے

فدا اس کی حفاظت میں ہم اپنی جان کردیں گے
وطن پر سب متاعِ زندگی قربان کردیں گے

جمہوریت کی بقا کے لیے پورے ملک بالخصوص حیدرآباد میں ملین مارچ اور ترنگا ریلی کے مناظر جو آنکھوں کے سامنے آئے ہیں، وہ بتا رہے ہیں کہ آج ملک کا باشعور شہری وطن کو نفرت کی آگ میں جھلسنے نہیں دے گا اور وطن کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار ہے، کیونکہ ہمارا ملک ایک ایسا ملک ہے کہ جس کی کثرت میں وحدت کا راز پنہاں ہے اور اسی کو موجودہ حکومت اقتدار کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے ہندو اور مسلمان میں بانٹنا چاہتی ہے، حالانکہ وطن دونوں کے لیے برابر ہے ؎

سچ ہے کہ نہیں سب کے مذاہب بھی یہاں ایک — اور یوں بھی سمجھ لو کہ نہیں سب کی زباں ایک
پھر بھی تو وطن ایک ہے اور سود وزیاں ایک — ہم سب کا خدا ایک ہے ہم سب کا نشاں ایک

پھر دل میں ہو کیوں خارِ عداوت کی چبھن آج

ہمارے ملک کے مستقبل طلباء اور طالبات ہیں، پرامن احتجاج کرنا یہاں کے ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ جامعہ ملیہ کے طالب علموں نے جب احتجاج کیا تو پولس اس قدر برانگیختہ ہوگئی کہ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ یہ لائبریری ہے، ریڈنگ روم ہے، مسجد ہے، لڑکیاں ہیں، بچے ہیں، اس بے رحمی سے لاٹھی چارج کیا کہ جس کی وجہ سے پولس کی اس حرکت پر گھن آتی ہے، مگر طالبات اور طلباء نے جس ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے، اس پر اس ملک کا ہر شہری اور ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ انہیں صدہا سلام پیش کرتا ہے اور پولس کی اس حرکت پر بھرپور مذمت کرتا ہے اور جے این یو میں یہی پولس غنڈوں کے سامنے اپنی آنکھیں موند لیتی ہے، ان طلباء کا کیا قصور تھا، بس اتنا کہ وہ فیس کے کم کرنے اور کالے قانون کے خلاف سوال اٹھا رہے تھے، نوجوانوں کا اس طرح اپنے ملک کے لیے متفکر ہونا اور غلامی جیسے کاموں سے آزادی کے لیے آواز لگانا اس ملک کے تابناک مستقبل کی علامت ہے اور امید قوی ہے کہ اس نئی صبح کو ہم بھی دیکھیں گے۔

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمت اقدس میں لے گئے، آپؐ نے پوچھا ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟ میں نے کہا کھجوروں کے لیے، ارشاد فرمایا کہ زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھالیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی۔

عباد بن شرحبیل مدینہ میں ایک صاحب تھے، ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے اور خوشے توڑ کر کچھ کھائے، کچھ دامن میں رکھ لیے، باغ کے مالک کو معلوم ہوا، تو اس نے آکر ان کو مارا اور کپڑے اتروالیے، یہ آنحضرت ﷺ کے پاس شکایت لے کر آئے، مدعا علیہ بھی ساتھ تھا، آپؐ نے اس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، کہ یہ جاہل تھا، اس کو تعلیم دینا تھا، یہ بھوکا تھا، اس کو کھانا کھلانا تھا، یہ کہہ کر کپڑا واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا۔

یہودیوں کا دستور تھا کہ عورتوں کو جب ایام آتے تو ان کو گھروں سے نکال دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے، آنحضرت ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو انصار نے آپؐ سے اس کے متعلق سوال کیا، اس پر آیت اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے، اس بنا پر آپؐ نے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں، یہودیوں نے آپ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے، دو صحابی آپؐ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں، رخسارۂ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا، دونوں صاحب چلے گئے، آپؐ نے ان کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں، اس وقت ان کو تسکین ہوئی کہ آپؐ ناراض نہ تھے۔

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے، ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ نے کچھ نہ فرمایا، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھوڈالیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی، آپؐ نے فرمایا اچھا آنے دو، وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے، لیکن جب وہ خدمت مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی، حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا اور آپؐ سے دریافت فرمایا کہ آپؐ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق وملاطفت کے ساتھ کلام کیا، آپؐ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے بڑا وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔

یہود جس درجہ شقی اور دشمنِ اسلام تھے، اس کا اندازہ گذشتہ واقعات سے ہو چکا ہوگا، باایں ہمہ آنحضرت ﷺ ان سنگ دلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف برتاؤ کرتے اور ان سے دادوستد رکھتے، سخت سے سخت غصہ کی حالت میں صرف اس قدر فرماتے ''اس کی پیشانی خاک آلود ہو''۔

قسط:(۱۹)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

ابواللیث صدیقی

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۴ء) ادیب، نقاد محقق ومصنف کی حیثیت سے معروف ہیں، کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ اور کولمبیا یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر رہے، اردو میں ایک درجن کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' ان کی مستند اور مشہور کتاب ہے۔

ابو اللیث صدیقی نے ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی کتاب ''شبلی ایک دبستان پر مقدمہ لکھا ہے۔ یہ کتاب پہلے ڈھاکہ سے غالباً ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی، ۲۰۱۵ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ نے دوسرا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ انھوں نے ''علامہ شبلی اور اردو'' اور ''علامہ شبلی نعمانی'' دو اہم مضامین بھی لکھے ہیں، لیکن شبلی ایک دبستان کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے، انھوں نے یہ واضح کیا ہے علی گڑھ تحریک سے اردو کو بہت فائدہ پہونچا اور اس نے بڑی ترقی کی جس میں شبلی کا بھی حصہ ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ سرسید کے بعد اپنے معاصرین میں شبلی کو کئی وجوہ سے تفوق حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سرسید کے بعد اپنے معاصرین میں شبلی ہی ایک ایسے شخص ہیں جنھیں سرسید کا پرتو کہا جاسکتا ہے، جن کی شخصیت سرسید کی طرح متنوع جن کا علم اور مطالعہ سرسید کی طرح وسیع اور دقیق اور جن کی نظر سرسید کی طرح دور بیں اور حقیقت شناس تھی اور یہی وجہ ہے کہ سرسید کے ان ساتھیوں میں کسی اور کے ہاتھوں کوئی ایسی تحریک شروع نہیں ہوئی جس نے ایک تحریک یا دبستان کی حیثیت حاصل کی ہو۔ شبلی کی ایک تحریک تھی جو ندوہ اور دار المصنفین کی صورت میں بڑھی اور پروان چڑھی تھی۔ ان کا ایک دبستان تھا جس میں ان کے لائق جانشین سید سلیمان ندویؒ اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ ملک کے دور دراز گوشوں میں اسلامی تاریخ و ثقافت، زبان وادب، مذہب ومعاشرت پر لکھنے والے شبلی کے نظریات کے علمبردار ہیں، اور ان کی تحریروں سے روشنی کے ایک بلند مینار کی طرح ہدایت پاتے ہیں۔ (شبلی ایک دبستان ص۹)

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے شبلی کی متنوع شخصیت اور پھر ان کی انفرادیت کا بھی ذکر کیا، یہی نہیں ان کا خیال ہے کہ شبلی نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شبلی صرف ایک شاعر، ادیب، انشا پرداز یا نقاد نہیں، وہ صرف ایک مضمون نگار اور مورخ بھی نہیں، دراصل سرسید کے بعد وہ دوسرے آدمی ہیں جنھیں عالم کہا جاسکتا ہے اور ان کے علم میں قدیم اور جدید کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے خالص مشرقی ہوتے ہوئے بھی ان کا طریق مطالعہ، استدلال اور طرز جدید ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ محض نقال یا مقلد نہیں ہیں اور نہ ان کی تحریریں محض مغربی مصنفین کے خیالات کا خلاصہ یا ان کی صدائے باز گشت ہیں۔ انھوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا''۔

(ایضاص ۹۔۱۰)

اس کے بعد انھوں نے شبلی کے ان کارناموں کا ذکر کیا ہے جس کے لئے وہ مشہور ہیں مثلاً تاریخ کے ساتھ اعتنا اور سیرت وسوانح عمریاں لکھنا، ادب اور تنقید کے جمود میں حرکت اور شاعری میں مقصدیت وغیرہ۔

بعض لوگوں نے خاص طور پر شیخ اکرم نے انھیں سرسید تحریک کا باغی بتایا ہے، ان کی تقلید میں بعض اور اہل قلم نے بھی بلا سوچے سمجھے غیر شعوری طور پر اس کو دہرایا ہے، مگر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ان لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ

''بعض لوگ کہتے ہیں کہ شبلی سرسید اور علی گڑھ تحریک کے باغی تھے، بغاوت کا جذبہ ان میں ضرور تھا لیکن اسے بغاوت کہنے کے بجائے آزادی فکر اور اپنی رائے پر خود اعتمادی کے جذبہ کے نام سے بھی پکارا جاسکتا ہے''۔(ایضاص ۱۱)

پروفیسر ممتاز حسین

ترقی پسند ادیب، نقاد اور محقق ومصنف پروفیسر ممتاز حسین (۱۹۱۸ء۔۱۹۹۲) نے مفتون احمد کی کتاب ''مولانا شبلی: ایک مطالعہ'' پر دیباچہ لکھا ہے، گو وہ مفتون احمد سے واقف نہیں تھے مگر ان کے تنقیدی مضامین سے بہت متاثر ہوئے۔

مفتون احمد (۱۹۲۹ء۔۱۹۷۴ء) مولانا عبد السلام ندوی کے نواسے اور علامہ شبلی کے چچازاد بھائی کے پوتے تھے۔ بندول میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ سے انگریزی اور تاریخ میں ایم اے اور پھر ایل ایل کی اسناد لیں، پاکستان سول سروس کا امتحان پاس کر کے اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے، مختلف وقتوں میں ڈپٹی کمشنر، ڈائرکٹر فیملی پلاننگ، ڈپٹی سکریٹری وزارت خوراک، ایسوسی ایٹ سمینٹ لاہور کے فائنانس ڈائرکٹر کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۹/نومبر ۱۹۷۴ء کو ہارٹ اٹیک سے انتقال کیا۔

مفتون احمد صاحب کا مطالعہ وسیع تھا اور ادب پر ان کی گہری نگاہ تھی، انھیں تحریر وتصنیف کا بھی عمدہ سلیقہ تھا، وہ نگار کے بڑے مضمون نگاروں میں تھے۔ علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے افکار وخیالات پر انھوں نے متعدد مضامین لکھے۔ ''مولانا شبلی ایک مطالعہ'' انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ علامہ شبلی سے متعلق مضامین کے جو مجموعے ۸۰ کے عشرے میں شائع ہوئے، ان میں اس مجموعہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ البتہ مفتون احمد صاحب نے علامہ پر بعض بڑی بے باکانہ تنقیدیں بھی کی ہیں۔

پروفیسر ممتاز حسین نے بھی اس مجموعہ کی تعریف کی ہے اور اس کے مطالعہ کے لئے مہمیز کیا ہے۔ علامہ شبلی کے بارے میں کئی باتیں لکھی ہیں، مثلاً ان کا خیال ہے کہ

''اگر شبلی کا قیام کچھ دنوں تک علی گڑھ میں نہ ہوتا اور اس زمانے میں انھیں براہ راست سرسید احمد خاں سے استفادہ کرنے کا موقع نہ ملا ہوتا تو وہ ایک ماڈرن یا روشن خیال مولوی نہ بن پاتے، لیکن شبلی کے ذہنی ارتقا کی یہ کڑی ان کی تصنیفات کے مطالعہ کے سلسلے میں اتنی اہم نہیں ہے جتنی کہ ان کی قوت مدافعت کہ انھوں نے اپنے جذبہ آزادی کو سرسید احمد خاں کی تعلیم غلامی سے محفوظ رکھا۔ ہر چند یہ بھی صحیح ہے کہ سیدی مصلحت اندیشی کا کچھ اثر ان میں بھی نفوذ کر گیا تھا''۔(دیباچہ مولانا شبلی ایک مطالعہ ص ۱۰)

پروفیسر ممتاز حسین کی ترقی پسند کے نقطہ نظر نے شبلی پر بعض تنقیدیں روا کردی ہیں، مثلاً وہ علامہ شبلی کو ایک متعصب مسلمان مورخ قرار دیتے ہیں اور بطور شہادت مضامین عالم گیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اسی طرح علامہ شبلی کی تاریخی کتابوں کو اسلامی رومانیت بتاتے ہیں اور پھر اس رومانیت پر تبصرہ کرتے ہیں کہ:

''اس اسلامی رومانیت سے جہاں ایک فائدہ ہندی مسلمانوں کو یہ پہنچا کہ مغرب کے مقابلے میں ان کا احساس کمتری کم ہوا، وہاں یہ نقصان پہنچا کہ وہ ماضی کے سحر زدہ ہوگئے، روشن مستقبل کا خواب دیکھنے کے بجائے سنہرے ماضی کا خواب دیکھنے لگے''۔(ایضاص ۱۱)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شبلی نے مغرب کو قبول کیا مگر جس قدر قبول کیا وہ ترقی کے لئے ناکافی تھا۔ البتہ وہ شبلی کی شاعری کے کسی قدر مداح ہیں۔

وہ ان کی شاعری کو مہر ووفا کی شاعری قرار دیتے ہیں اور یہ بھی کہ اس میں خوئے آزادی کا جذبہ موجود تھا، لیکن بحیثیت مجموعی انھیں بڑا شاعر تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ایک نئی اصطلاح میں خوشگوار شاعر قرار دیتے ہیں۔ وہ شبلی کو بڑا مفکر بھی تسلیم نہیں کرتے لیکن ان کے ادبی مذاق کے بڑے قائل ہیں، لکھتے ہیں:

''اگر شبلی بحیثیت ایک ناقد کے اردو ادب کے کوچے میں قدم نہ رکھتے تو شاعری سے متعلق ہمارا مذاق صحیح کب کا بگڑ چکا ہوتا، کیا شعرالعجم اور کیا موازنہ انیس ودبیر، ان دونوں کتابوں نے ہمیں اس بدمذاقی سے بچایا ہے جو یاروں نے پیروی مغرب میں پیدا کر رکھی تھی اور جس کا سلسلہ ابھی تک بعض حلقوں میں جاری ہے اور پھر شبلی کا انداز بیاں کتنا فطری واضح، سبک اور گوارا ہے۔ تنقید میں شبلی سے بہتر اسلوب تو کسی اور کا نظر آتا نہیں ہے''۔(ایضاص ۱۲)

حافظ نذر احمد

حافظ نذر احمد (۱۹۱۹ء۔۲۰۱۱ء) پاکستان میں شبلی کے سب سے بڑے شیدائی تھے۔ ان کے نام سے لاہور میں شبلی کالج قائم کیا، اس کے پرنسپل رہے۔ ۸/مئی ۱۹۶۸ء کو یوم شبلی کا بڑے پیمانہ پر انعقاد کیا جس میں پاکستان کے نامور اہل قلم ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، مولانا سید مرتضی حسین فاضل اور پروفیسر شیخ محمد عثمان وغیرہ نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے، اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے کی تھی۔ اس سمینار میں پیش کئے گئے مقالات کا مجموعہ ''مقالات یوم شبلی'' خود حافظ نذر احمد نے مرتب کیا جسے ان کی قائم کردہ مسلم اکادمی لاہور نے شائع کیا۔ اس کا مختصر سا دیباچہ پیش نہاد کے عنوان کے نام سے مقالات یوم شبلی میں شامل ہے، اس کی سطر سطر سے عقیدت کے پھول جھڑتے ہیں، فرماتے ہیں:

''لاہور علم وفن کا مرکز ہے، یہاں ہر روز دو چار علمی ادبی مجالس منعقد ہوتی رہتی ہیں اور آئے دن مشاہیر کی یاد میں تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے۔ لیکن کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ہم نے ایک عظیم جامع الصفات شخصیت کو یکسر بھلا دیا اور کبھی بھول کر بھی انھیں یاد نہیں کیا۔ میری مراد علامہ شبلی نعمانی کی عظیم شخصیت سے ہے''۔

(مقالات یوم شبلی ص ۷)

علامہ شبلی کی خوش بختیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کو بجا طور پر ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ وہ معلم بھی تھے اور مصنف بھی۔ سیرت نگار بھی تھے اور مورخ بھی۔ ادیب شہیر بھی تھے اور تاریخ ادبیات کے ماہر بھی۔ وہ یگانہ محقق بھی تھے اور ماہر نقاد بھی۔ انھوں نے ایک طرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے چمن کی آبیاری کی، دوسری طرف ندوۃ العلما کی منفرد درس گاہ کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے دارالمصنفین جیسا عظیم تصنیفی ادارہ قائم کیا اور اپنے پیچھے مشہور زمانہ شاگردوں کی جماعت چھوڑ گئے، یہ

خوش بختی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے''۔(ایضا)

حافظ نذر احمد علامہ شبلی کے افکار سے بہت متاثر تھے جس طرح علامہ شبلی علی گڑھ میں کلاسیز شروع ہونے سے پہلے درس قرآن دیا کرتے تھے اسی طرح شبلی کالج لاہور میں وہ خود درس قرآن دیتے۔ اس کے لئے انھوں نے بچوں کے ذہن ومزاج کے مطابق کتابیں لکھیں، قرآن پاک کا ترجمہ کیا، اس کی تفصیل کسی قدر ان کی خودنوشت میں آگئی ہے اور راقم نے اس کا ذکر اپنی کتاب ''شبلی: خودنوشتوں میں'' کیا ہے۔

علامہ شبلی نے ندوہ کا جو نصاب تیار کیا تھا حافظ نذر احمد اس کے بڑے مداح ہیں، مقالات یوم شبلی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نے ندوۃ العلما میں جو نصاب رائج کیا اور اس منفرد دارالعلوم کی بنیاد جن خطوط پر رکھی وہ ہمارے لئے آج بھی سنگ میل اور روشنی کا مینار ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہم پاکستان میں بھی اس پایہ کا کوئی تعلیمی وتربیتی ادارہ قائم کرسکتے جو بے شک اپنے مقاصد کے اعتبار سے قدیم ہوتا لیکن عمل اور طریقہ عمل میں جدید''۔

(ایضاص ۸)

۱۹۴۷ء میں مملکت خداداد قائم ہوئی، اس کے ۲۱ ربرس بعد پہلی بار شبلی کالج لاہور نے علامہ شبلی پر پہلی تقریب منعقد کی۔ یہی نہیں حافظ نذر احمد کو اس کا سبب بھی بتانا پڑا مگر دیکھیں علم کے اس شیدائی نے کیا کہا:

''قیام پاکستان کے بعد پہلی بار لاہور میں علامہ شبلی نعمانی کی پیدائش کے دن ۸ رمئی ۱۹۶۸ء کو یوم شبلی کی تقریب ہوئی۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے فرمائی۔ اس تقریب کا انعقاد واہتمام شبلی کالج کے طلبا کی انجمن بزم ادب نے کیا۔ شبلی کالج کے بانی یا منتظمین کا اگرچہ علامہ شبلی کی ذات سے کوئی خونی رشتہ نہیں لیکن ہم پر علامہ کے دوگونہ حق ہیں، ایک اس لحاظ سے کہ ہم بھی ان کے علمی ورثہ کے خوشہ چینوں میں سے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے کالج کی نسبت ان کے نام نامی سے ہے''۔(ایضاص ۸)

اس وقت تک علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش کی تعیین نہیں ہوئی تھی، غالباً اسی وجہ سے ۸ رمئی کی تاریخ کو تقریب منعقد ہوئی، اب صحیح تاریخ پیدائش ۴ رجون ۱۸۵۷ء کی تعیین پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحقیق سے ہوگئی ہے۔

پروفیسر غلام محمد

پروفیسر غلام محمد (۱۹۲۱ء۔۱۹۹۳ء) مولانا سید سلیمان ندوی کے خلفاء میں ہیں، ''تذکرہ سلیمان'' انھیں کے قلم سے ہے، انھوں نے سید صاحب کے مجموعہ کلام ''ارمغان سلیمان'' پر دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''(سید صاحب) مروجہ نصاب تعلیم ختم کرکے جب لکھنؤ پہونچے تو گویا شعروسخن کے اصل گہوارہ میں آگئے اور یہاں آکر دامن تربیت بھی ملا تو شبلی جیسے استاذ فن کا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں پختہ شاعری کے جوہر دکھانے لگے''۔

(ارمغان سلیمان ص ۴)

یہی نہیں وہ بعد میں علامہ شبلی ہی کے رنگ میں نظمیں کہنے لگے، پروفیسر غلام محمد صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی کی رحلت کے بعد بعض نظمیں من وعن شبلوی رنگ میں لکھیں اور اہل فن سے استاذ کی ہمرنگی پر داد پائی، مگر فرماتے تھے کہ عمادالملک بلگرامی نے یہ تحریر فرمایا کہ آپ کی نظمیں مولانا شبلی کی یاد تازہ کرتی ہیں مگر آپ اپنی توجہ شاعری پر صرف نہ فرمائیں، تو طبیعت شعرگوئی سے بالکل ہٹ گئی''۔(ایضاص ۶)

مولانا صدرالدین اصلاحی

ایمان بالآخرت

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ایمان بالآخرت کی اصل اور حقیقت کا تعلق ہے، وہ فی الواقع اور ایمان باللہ ہی کی فرع ہے اور اس لیے اس کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ثانوی ہے، مگر دین حق کی اتباع واطاعت اور اقامت کے زاویۂ نظر سے اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے لحاظ سے یہ اس کے مقابلہ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا مالک نہیں ہے، بلکہ بعض اعتبارات سے تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ انسان کی جبلّت میں جو عجلت پسند، حاضر طلبی اور عاجلہ پرستی ودیعت ہے، اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح بھی باور نہیں کیا جاسکتا کہ اگر انسان کو اپنے اعمال کی باز پرس کا اندیشہ ہو تو وہ نیکی وحق پرستی کی سنگلاخ وادی قطع کرنے پر تیار ہوگا۔ اس کو اللہ کی ذات اور اور یکتائی کا لاکھ یقین سہی، مگر جب اسے یہ معلوم ہو کہ میرے ہر عمل کا آخری اور قطعی انجام وہی ہے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور موت کا پردہ گرتے ہی زندگی اور اس کی تمام حرکات کا تماشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجانے والا ہے تو نرانا دان ہی ہوگا، اگر اس نے ''بعیش کوش'' کے فتوے پر عمل نہ کیا اور دنیا اس کی بدقسمتی کا ماتم ہی کرے گی، اگر اس نے جی کھول کر داد نفسیات نہ دی۔ بخلاف اس کے اگر اس کو قیامت کے آنے اور اعمال کا حساب کتاب لیے جانے کا پورا یقین ہو تو بہر حال اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو کسی نہ کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند رکھے گا۔ نہ صرف وحدانیت کا قائل ہونے ہی کی صورت میں بلکہ اگر ایسا عملاً ممکن ہو تو مشرک ہوتے ہوئے بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مشرکانہ عقائد اللہ کہ ہاں اس کے اعمال کو میزان محاسبہ میں بے وزن بنادیں، لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، ایک مشرک کا ایک منکر قیامت کے مقابلہ میں کسی ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونا زیادہ قرین قیاس ہے اور اس سے نسبتاً اس بات کی زیادہ توقع قائم کی جاسکتی ہے کہ وہ ہوائے نفس کے ہاتھوں بالکلیہ اپنی زمام کار سونپ دینے سے مجتنب رہے گا، اس لیے ایمان بالآخرت کو ایمان باللہ کے برابر یا بعض اعتبارات سے اس سے بڑھ کر اہمیت دینا خلاف واقعہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن جس شدومد اور جس تفصیل وتصریف کے ساتھ توحید پر دلائل دیئے ہیں، معاد وقوع پر آفاق وانفس کی محکم اور دل نشین شہادتیں بہم پہنچانے میں اس سے کم زور نہیں صرف کیا ہے۔ قرآن پر نگاہ ڈالیے تو صفحہ کے صفحہ اور مکی صورتوں میں تو قریب قریب پوری پوری صورتیں قیامت کے پر ہول اور دہشت ناک کوائف کے ذکر اور اس کے وقوع کے امکان اور اس کی اخلاقی ضرورت کے دلائل سے لبریز نظر آئیں گی۔ جو شہادت ہے اس امر کی کہ قرآن کے نزدیک عقیدۂ آخرت کا دلوں میں اذعان پیدا کرنا (توحید کے بعد) تمام حقائقِ دینی سے اہم تر اور مطلوب تر ہے۔ جس قرآن کے اعجاز وبلاغت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، اس کی کسی امر کے ساتھ یہ اعتنا کہ اپنے الفاظ کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس کی نگاہ میں اس ایک امر کی دوسرے حقائق دینی پر وہی فوقیت ہے جو فوقیت آفتاب کو اپنے گرد گھومنے والے کرہ پر حاصل ہے۔ جس طرح قرآن آفتاب کا مرکز کشش ان تمام اجزام فلکی کے قیام وبقا اور اس کا سرچشمۂ نور ان سب کی تابناکیوں کا ضامن ہے، اسی طرح یہ عقیدۂ آخرت (عقیدۂ توحید سے ہمدست ہوکر) ساری نیکوکاریوں کا کفیل ہے۔ اگر اس عقیدہ کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوتی تو وہ قرآن جس نے نماز جیسی عبادت کا صرف حکم دینے پر اکتفاء کرلیا

اور اس کے احکام، اس کے طریقۂ ادا اور اس کی رکعات اور ارکان وغیرہ کی تفصیلات بیان کرنے پر چند کلمات کہنا اور چند لمحہ دنیا بھی غیر ضروری سمجھا، وہ اس کے بیان کے سلسلے میں الفاظ اور اوقات کے اس بے دریغ خرچ سے ہرگز کام نہ لیتا، جس کا مشاہدہ قرآن کے صفحات میں ہم کر رہے ہیں۔

ایمان بالآخرت کا اندازہ ایک اور پہلو سے لگائیے۔ بلاشبہ قرآن کی دعوت عقیدہ توحید پر قائم ہے، اس لیے جس قدر زور اثبات توحید پر اس نے دیا ہے، حق یہ ہے کہ اسے دینا ہی چاہئے تھا، مگر اس زور اور اہتمام کے باوجود جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ منکرینِ اسلام نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کھائی تو ایک حیرت سی ہوتی ہے، کیونکہ قرآن نے عام طور سے استدلال کا جو طریقہ اختیار فرمایا ہے، وہ شک اور تردد کی ایک ایک گرہ کھول کر رکھ دینے والا ہے، جس کے بعد انکار توحید کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کوئی معمولی سے معمولی بنیاد بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ وہ عموماً مشرکینِ عرب کے مسلمات ہی کو اپنی بحث کا مبنیٰ قرار دیتا ہے، وہ پوچھتا ہے کہ بتاؤ اس کائنات کا خالق کون ہے؟ کون ہے جو تمہیں پیدا کرتا ہے اور تمہاری پرورش کرتا ہے؟ کون ہے جو ہوائیں چلاتا ہے؟ پانی برساتا ہے؟ کھیتیاں اگاتا ہے؟ گرمی اور روشنی بخشتا ہے؟ باقاعدگی کے ساتھ دن اور رات لاتا ہے؟ تمہیں موت اور حیات دیتا ہے؟ پھر ان کی زبانِ حال، زبانِ فطرت اور زبانِ اعتقاد سے جواب دلاتا ہے کہ اللہ اور صرف اللہ۔ اب وہ کہتا ہے کہ اچھا، اگر یہ سب کچھ تمہیں تسلیم ہے تو ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ”کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟“ کیا اس کے ساتھ ہی واقعی تمہاری عقل اس امکان کو بھی باور کرتی ہے کہ اللہ کے سوا اور بھی کچھ ہستیاں جو الوہیت کا مقام رکھتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب اثبات میں دینے کے لیے بڑی شرمناک سفاہت اور انتہائی دیدہ دلیری کی ضرورت ہے، اس لیے ان کی زبانیں خاموش رہ جاتی ہیں، لیکن اب وہ فرار کی ایک نئی راہ ڈھونڈ نکالتے۔ کہتے ”ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ ہستیاں اللہ رب العالمین کی مدِ مقابل ہیں اور بالذات صفتِ الوہیت سے متصف، بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ وہ اللہ کی مقرب بارگاہ ہستیاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایک محدود دائرے میں (اس دائرے میں جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہے) نفع ونقصان کے اختیارات انہیں بخش رکھے ہیں، اس لیے ہمیں ان کی بھی پرستش کرنی چاہئے۔ ہم انہیں صرف ارباب (عطائی اختیارات والے) مانتے ہیں اور اللہ کو الارباب (سارے ذاتی اختیارات والا) اس پر قرآن فرماتا ہے کہ اچھا وہ سند لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے ان ”معبودانِ باطل“ کے بارے میں تم پر نازل فرمائی ہے۔ آخر تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے انہیں اپنی سلطنت میں اس طرح کی گورنریاں عطا کر رکھیں ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بحث وجدال کی آخری راہ بھی بند ہو جاتی ہے۔ مگر حشمِ حیرت بھی دیکھتی ہے کہ اختلاف کا زور اور انکار وتکذیب کا طوفان جوں کا توں قائم ہے، نہ صرف قائم ہے بلکہ اس میں مزید شدت پیدا ہو چلی ہے۔ اس عجیب وغریب صورتحال کی توجیہہ سے عقل اور منطق تو درماندہ رہ جاتی ہیں، مگر اسرار غیب کا جاننے والا اور نفسیاتِ انسانی کا خالق یہ کہہ کر اس راز سے پردہ اٹھاتا ہے کہ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (بنی اسرائیل) اے پیغمبر جب تم قرآن پڑھتے ہو (اور ان منکروں کو سناتے ہو) تو ہم تمہارے اور ان منکرینِ آخرت کے درمیان بڑی سخت روک حائل کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں کہ وہ (قرآن کی باتوں کو) سمجھ نہ پائیں، نیز ان کے کانوں کو بہرہ کر دیتے ہیں اور جب تم قرآن کے اندر صرف ایک اللہ ہی کا ذکر کرتے ہو تو وہ بدک کر منہ موڑے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں“۔

ڈاکٹر رفیق احمد قاسمی۔استاد جامعہ مظہر العلوم بنارس

ڈاکٹر محمد حمید اللہ: امتیازی کارنامے

دنیا میں ایسی چند شخصیات ہوتی ہیں جن کے علمی وتحقیقی کارنامے تاریخ کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ یہ زمانہ اور خط کے قید وبند سے آزاد ہوتے ہیں اور بعد میں ان کارناموں پر تحقیق کے بعد ان شخصیات کی گوناگوں صلاحیتوں کا اعتراف ہوتا ہے اور ان کا تحقیقی کام اہل علم ودانش کے نزدیک موضوع بحث بنتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی ہی شخصیات تاریخ ساز ہوتی ہیں۔ انہی شخصیات میں سے ایک ڈاکٹر حمید اللہ تھے، جنہوں نے ۹۵/برس کی عمر پائی اور نصف صدی پیرس میں قیام کے بعد ۱۷/ دسمبر ۲۰۰۲ء کو امریکہ کے پنسلوانیہ میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی شخصیت، علمی مقام ومرتبہ اور نمایاں خدمات وکارنامے سے اہل علم وتحقیق عمومی طور پر واقف ہیں، پھر چاہے آپ کی متعدد عالمی زبانوں پر دستگاہی ہو، نادر ونایاب علمی مخطوطات کی تحقیق واشاعت ہو، مستشرقین ومعاندین اسلام کی جانب سے اسلام کی بنیادوں کو کمزور کرنے کے مقصد سے کئے جانے والے اعتراضات کا تشفی بخش جواب ہو یا پھر اعلیٰ پایہ کی نادر تحقیقات، ہر حیثیت سے آپ کی شخصیت تمام دنیا میں مسلم اور قابل اعتماد سمجھی گئی، ڈاکٹر حمید اللہ مشرق اور مغرب کی نو زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور چار میں (اردو، عربی، انگریزی اور فرنچ) بلاواسطہ تحریر وتقریر کی خدمات انجام دیا کرتے تھے، مطالعہ اور گفتگو کی اعلیٰ استعداد جرمنی، اطالوی، فارسی، ترکی اور روسی زبان میں بھی حاصل کرلی تھی۔

ابتدائی تعلیم:

ڈاکٹر صاحب کا گھرانا انتہائی روحانی اور صوفی گھرانا تھا۔ جدید تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق آپ نے گھر میں ابتدائی تعلیم کے بعد جامعہ نظامیہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۴ء میں مولوی کامل کا درجہ مکمل کیا۔ بعد ازاں گھر والوں کو بتائے بغیر انگریزی زبان کی اہمیت کے پیش نظر میٹرک کے امتحان کی تیاری کے بعد میٹرک کا امتحان بھی دیا اور امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ اُن کے والد کو مقامی اخبارات کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب کی کامیابی کی اطلاع ملی۔ اس کامیابی کے بعد انہوں نے بیٹے کی مزید حوصلہ افزائی کی۔

اعلیٰ تعلیم:

۱۹۲۴ء میں آپ نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا اور اسلام، علم قانون میں ایم اے اور ایل ایل بی کی سند جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۳۰ء میں حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے اسلامی قوانین بین الاقوامی میں ڈاکٹریٹ کے لیے آپ کو فیلو شپ سے نوازا گیا۔ ۱۹۳۲ء میں جامعہ بون، جرمنی سے آپ نے ڈی فل کی سند حاصل کی اور پھر اسی جامعہ میں عربی واردو کے استاد کی حیثیت سے متعین ہوئے۔ جرمنی میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد آپ نے ڈاکٹریٹ کی ایک اور سند کے لیے فرانسیسی دارالحکومت پیرس کی معروف جامعہ سوربون میں داخلہ لیا۔ ۱۱/ماہ کے مختصر عرصے میں آپ نے ڈی لٹ کی سند حاصل کی۔

باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم روایتی طرز پر ہوئی اور اولین علمی وفکری بنیاد خالص اسلامی ادارہ میں آپ

نے حاصل کی، لیکن اپنے علمی شوق اور بلند ہمتی کے باعث آپ نے دنیا کے بڑے مستند جامعات میں اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی، تصنیف وتالیف کا ملکہ آپ میں شروع دور سے ہی تھا، لیکن جوں جوں آپ اپنے تعلیمی مراحل میں آگے بڑھتے گئے، ان کا علمی وادبی اور تحقیقی ذوق مزید نکھرتا چلا گیا اور آپ تصنیف وتالیف کے میدان میں قیمتی لعل وگہر کے خزانے لٹائے اور عالمی ادب میں اپنا ایک منفرد مقام اور امتیازی شناخت قائم کی۔

ان کے علمی کاموں میں ایک خاص بات اور تھی کہ وہ مستقبل کے تقاضوں کی احاطہ بندی کرتی ہے اور عصری معنویت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر حمیداللہ نے قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ سے لے کر اسلام کے مختلف گوشوں بشمول خلافت اور میثاق مدینہ پر بڑے دقیق اور فکر انگیز کام کئے۔

ڈاکٹر حمیداللہ کے میثاق مدینہ پر کئے گئے علمی وتحقیقی کاموں کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی بار انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ دنیا میں سب سے پہلے مخلوط وجمہوری حکومت محمدؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں قائم کی تھی، جس میں عیسائی، یہودی ودیگر مکاتب فکر کے نمائندہ افراد بھی شامل تھے اور اس کی سربراہی خود وہی کررہے تھے۔

ڈاکٹر حمیداللہ کے علمی کاموں میں ایک اہم کام یہ بھی ہے کہ عہد نبویؐ میں نظام تعلیم کیا تھا؟ اپنی تحقیق کے ذریعہ انہوں نے اس پہلو کو پورے طور پر اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمدؐ نے اپنے دور میں مکاتب ومدارس کے انتظام، امتحانات، اقامت خانے، ابتدائی تعلیم اور لکھنے پڑھنے کو سکھانے کے بندوبست، اجنبی زبانوں کی تعلیم، نصاب تعلیم، بچیوں اور عورتوں کی تعلیم کا پورا نظام قائم کررکھا تھا۔ وہ اس سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے نظم کیا تھا۔ مثال کے طور پر ہجرت کے ڈیڑھ ہی برس بعد جب ۷۹۔۶۰ مکہ والے جنگ بدر میں گرفتار ہوکر مدینہ لائے گئے تو رسول کریمؐ نے ان لوگوں کی جو مالدار نہیں تھے، رہائی کے لیے یہ فدیہ مقرر کیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھائیں۔ ایک صحابی عبادہ ابن صامت کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے مجھے صفہ میں اس غرض سے مامور کیا تھا کہ لوگوں کو لکھنے اور قرآن کی تعلیم دوں۔ صفے سے مراد مکان کا ملحق حصہ ہوتا ہے۔ یہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا جو اس غرض کے لیے مختص کردیا گیا تھا کہ باہر سے تعلیم کے لیے آنے والوں بلکہ خود مقامی بے گھر طالب علموں کے لیے دارالاقامہ کا بھی کام دے اور مدرسہ کا بھی۔ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قبائلی نمائندے تعلیم کی غرض سے مدینہ آتے تھے اور ان کے قیام وطعام اور تعلیم وتربیت کی نگرانی خود محمدؐ فرماتے تھے۔ عہد نبوی میں ایک فنی ذوق یا تخصص بھی ترقی کرگیا تھا اور خود رسول اکرمؐ اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ نصاب کے تعلق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کے ہمہ گیر نصاب کے علاوہ نشانہ بازی، تیراکی، تقسیم ترکہ کی ریاضی مبادی طب، علم ہیئت، علم انساب اور علم تجوید القرآن کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ایک حدیث کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ استاد کی عزت کی جائے یا علم بغیر عمل کے بے سود ہے۔ علم میں تجارت کے اصول وضوابط بھی شامل تھے۔

ڈاکٹر حمیداللہ نے مستشرقین کے طریق تحقیق (Methodology) پر ایسی ہی قدرت حاصل کرلی تھی، جیسی غزالی نے یونانی فلسفہ پر، وہ تحقیق اور طریق تالیف کے باب میں مستشرقین کے راستہ پر تھے لیکن اس پہلو سے ان سے مختلف تھے کہ ان کا قبلہ درست تھا، ان کے اصل مآخذ قرآن وسنت اور مسلمانوں کے معتبر اہل علم کی تصانیف تھیں، انہوں نے اسلام کو، جیسا کہ وہ ہے، دنیا کے سامنے پیش کیا۔ البتہ تحقیق وتصنیف، تلاش وجستجو، نقد واحتساب کے ان تمام ذرائع کو کامیابی اور قدرت کے ساتھ استعمال کیا جو مستشرقین کا طرۂ

امتیاز سمجھے جاتے ہیں اور اس طرح علمی میدان میں اہل مغرب کا جو قرض مسلمانوں پر تھا، اسے فرضِ کفایہ کے انداز میں ڈاکٹر صاحب نے چکا دیا اور ساتھ ساتھ وہ کیا جسے انگریزی محاورے Paying in the same coin کہا جاتا ہے۔

فرانسیسی زبان میں قرآن پاک ترجمہ اور فرانسیسی زبان ہی میں دو جلدوں میں سیرتِ پاک کی تدوین بھی ان کے نمایاں کاموں میں سے ایک ہے۔ سیرت کی کتاب انگریزی ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی کیا ہے جو شائع ہو گیا ہے۔ ۱۰۰ر سے زیادہ مقالے اور مضامین ان کے قلم سے نکلے اور اہل علم کی تشنگی دور کرنے کا ذریعہ بنے۔ یقیناً ان کی چھوٹی بڑی کل کتب کی تعداد ۱۵۰ر سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہؒ کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ بڑا وسیع تھا اور اس حیثیت سے ان کا کام کثیر جہتی (Multi-Dimensional) تھا۔ انہوں نے تحقیق کے مختلف میدانوں میں بڑے معرکہ کی چیزیں پیش کیں لیکن شاید ان کی سب سے زیادہ دین (Contribution) مسلمانوں کے بین الاقوامی قانون کے میدان میں ہے جس میں انہوں نے علمی دنیا سے یہ منوالیا کہ بین الاقوامی قانون کے اصل بانی مسلمان فقہا اور علما ہیں، سترہویں صدی کے مغربی مفکرین نہیں۔ تدوین حدیث کے باب میں بھی ان کا کام بڑا وقیع ہے اور صحیفہ ہمام ابن منبہ کی تالیف اور اشاعت ان کا بڑا کارنامہ ہے، جس نے یہ ثابت کر دی کہ حدیث کی کتابت دورِ رسالت مآبؐ اور دورِ خلافت راشدہؓ ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ یہ مسودہ ان کو جرمنی کی ایک لائبریری سے ملا جس کو مناسب انداز میں ایڈٹ کر کے اور یہ دکھا کر اس اوّلین مسودے میں لکھی ہوئی احادیث اور بعد کے مجموعوں میں پائی جانے والی احادیث میں کوئی فرق نہیں ہے، انہوں نے بڑے سائنسی انداز میں حدیث کی صحت کو منوانے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ حضور پاکؐ کی سیاسی زندگی، آپؐ کے غزوات، سفر ہجرت، خطوط اور وثائق کی تلاش اور ترتیب، ان سب میدانوں میں ڈاکٹر حمید اللہ نے تحقیق اور تسوید کے وہ نقوش قائم کئے ہیں جو تا دیر چراغِ راہ رہیں گے۔

اسلامی فقہ کی تدوین اور خصوصیت سے امام ابوحنیفہؒ کی Methodology پر ان کا کام راہ کشا کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی قانون اور قانونِ روما کے فرق کو بھی انہوں نے بڑے قاطع دلائل سے ثابت کیا اور مستشرقین کے اس غبار سے ہوا نکال دی کہ اسلامی قانون در اصل قانونِ روما سے ماخوذ ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے ترجموں کی معلومات کو جمع کرنا بھی ان کا ایک پسندیدہ موضوع تھا اور اس سلسلے میں ان کی کاوش بنیادی کوشش کا مقام رکھتی ہے۔ ان کے طرزِ تحقیق میں صرف کتابی محنت ہی شامل نہ تھی۔ حضورِ پاکؐ کے سفر ہجرت کی تحقیق میں انہوں نے پاپیادہ اور گھوڑے اور اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس راستے پر عملاً سفر کیا، جس سے حضورِ پاکؐ نے ہجرت فرمائی تھی اور اس طرح اس شاہراہ کو متعین کیا جو روایات میں دھندلی ہو گئی تھی۔ قرآن پاک اور سیرتِ مبارکہ ان کی زندگی کے صورت گر ہی نہ تھے، ان کی علمی دلچسپی کا بھی محور تھے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا خاص موضوع:

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب بنیادی طور پر قانون داں تھے، وہ روایتی تعلیم کے بعد جب جدید تعلیم کی تحصیل میں منہمک ہوئے تو اوّلاً جامعہ عثمانیہ سے قانون (ایل، ایل، بی) ہی تعلیم حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گئے تو وہاں ان کی فکر و تحقیق میں یہی موضوع غالب رہا، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں بون یونیورسٹی سے ''اسلام کے بین الاقوامی تعلقات'' کے موضوع پر نہایت محققانہ مقالہ لکھ کر ڈی۔فل کی سند حاصل کی، ۱۹۳۶ء میں فرانس آ گئے اور سوربون یونیورسٹی سے ''عہد نبوی اور خلافت

راشدہ میں اسلامی سفارت کاری'' کے موضوع پر معرکۃ الآراء مقالہ لکھا جس پر ڈی۔لٹ کی ڈگری تفویض ہوئی، گویا آخر تک ان کی تعلیمی زندگی کا اصل موضوع قانون بین الممالک ہی رہا۔

یورپ سے وہ حیدرآباد واپس آئے تو جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الممالک ہی کے استاذ مقرر ہوئے، جامعہ عثمانیہ میں ان کے استاذ پروفیسر حسین علی مرزا کی کوششوں سے اس شعبے کا قیام عمل میں آتا تھا، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر حمیداللہ مرحوم کو ہندوستان میں قانون بین الممالک کے تلامذہ واساتذہ کے سابقین الاوّلین میں ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، اس وقت قانون بین الممالک کے موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہ تھی، جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں جس انگریزی کتاب کی طرف طلباء کو رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی تھی وہ عصری ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر تھی، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے طلباء کی ضرورت کے پیش نظر اس موضوع کی پہلی کتاب ''قان بین الممالک کے اصول اور نظریں'' کے نام سے لکھی، جو مکتبہ ابراہیمہ حیدرآباد سے ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوئی، اس سبب تالیف خود ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا موضوع ہمارے ملک کے لیے تو نہیں البتہ ہماری زبان کے لیے بالکل نیا ہے، اس پر کوئی کتاب نہیں کوئی مضمون تک ہندوستانی زبان میں میرے دیکھنے میں نہیں آیا، اس سال جامعہ عثمانیہ میں اس پڑھانا بالکلیہ میرے سپرد کیا گیا تو وقت بہت کم تھا اور چیزیں بہت، میں نے طلباء کے سامنے جو زبانی لیکچر دیئے یا جو ابھی دینے باقی ہیں ان کو سردیوں کی تعطیلوں سے فائدہ اٹھا کر قلم بند کرتا ہوں، یہ چھوٹا سا رسالہ طلباء کی امتحانی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اگر ضرورت سمجھی گئی تو آئندہ زیادہ ٹھوس اور زیادہ پھیلا ہوا مواد پیش کیا جائے گا اور علوم وفنون کے برخلاف قانون بین الممالک کا تعلق زیادہ تر مملکتوں کے باہمی برتاؤ سے ہے اور اسی لیے روز ہی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، نصاب میں جس انگریزی کتاب کو دیکھنے کی سفارش کی گئی ہے وہ گیارہ سال پرانی ہے اس کے مواد کو عصری بنانا پہلا مقصد ہے''۔

دوملکوں کے درمیان تعلقات کی عام طور سے تین نوعیتیں ہوتی ہیں، یعنی مسالمانہ، مخاصمانہ اور غیر جانبدارانہ۔ یہ کتاب ان تینوں نوعیّتوں کے مباحث پر حاوی ہے، کتاب مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے، جنہیں مقاصد کا عنوان دیا گیا ہے، مقدمہ میں حکومت وسلطنت کی نشوونما اور ایک دوسرے سے باہمی ربط وضبط کے ابتدائی قوانین وغیرہ کی اجمالی تاریخ قلم بند کی گئی ہے، مصر، فلسطین، ہندوستان، یونان اور روم کے ساتھ مسیحیت اور اسلام کے اثرات دکھائے گئے ہیں، جدید یورپ کا بھی ذکر ہے، اس کے بعد قانون اور مملکت کی تعریف، خودمختاری اور اس کے اقسام نیابت، بغاوت وغیرہ کا ذکر ہے، مسالمانہ اور غیر جانبدارانہ اصول وقوانین مثلاً آزاد حکومتوں کے اپنے حقوق اور حالت جنگ وامن میں مختلف حکومتوں کے باہمی حقوق وفرائض وغیرہ کی تفصیل ہے۔

قانون بین الممالک کے سلسلہ کی یونانی، رومی قرون وسطی، تاریخ اسلام اور جدید مغرب کی خصوصیتیں بھی بیان کی گئی ہیں، جس سے یہ تاثر پختہ ہوتا ہے کہ جدید تہذیب وتمدن اسلامی قوانین کے ہم پلہ نہیں۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یورپ کے اہل قلم کے برعکس قانون بین الممالک کے سلسلہ میں یورپ وامریکہ کے بالمقابل تاریخ اسلام اور

تاریخ ہند سے بھی واقعات کی نظیریں پیش کی ہیں اور ان سے استناد کیا ہے، کتاب کی اس اہم خوبی پر مولانا سلیمان ندوی کی نظر گئی اور انہوں نے خاص طور پر اس کی داد دی۔

یورپ کے اہل قلم بالخصوص مستشرقین جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو روم ویونان کے ذکر کے بعد جدید یورپ کی مدح سرائی پر آجاتے ہیں اور درمیان کی ایک ہزار سالہ تاریخ اسلام کو سرے سے نظر انداز کر دیتے ہیں، قانون بین الممالک کے سلسلہ میں بھی ان کا یہی متعصّبانہ رویہ رہا، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ان کی اس کمی کو محسوس کیا، چنانچہ اپنی اس کتاب میں پہلی مرتبہ اسلام کے بین الممالک اصول وقوانین کا ذکر واعتراف کیا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی کتاب کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کی شکل میں ڈاکٹر حمید اللہ نے علمی دنیا کے لیے ایک قیمتی چیز پیش کر دی، اب بطور خاص اردو میں اس موضوع پر ایسی مستند اور جامع کوئی کتاب نہیں تھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب کے عالمانہ مباحث، تجزیاتی طرز اسلوب اور محققانہ ژرف نگاہی نے بہت سی یورپی کتابوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، اس کتاب کے ذریعہ قانون بین الممالک کے باب میں اسلامی اصول وضوابط اور نظریات بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی اور دیگر نظامہائے سیاست اور اسلام کا معروضی تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا گیا، عام تو عام بہت سے اہل علم حضرات بھی اس موضوع کی حساسیت اور اہمیت سے کم ہی واقف تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے یہ کتاب لکھ کر اردو داں طبقہ کو اس موضوع کے تئیں بیدار اور باشعور کر دیا، ظاہر ہے کہ آج انقلابی دنیا کے جدید سیاسی واقتصادی حالات سے آگہی اور ان کے فہم کے لیے اس موضوع پر نظر نہایت ضروری ہے، ورنہ عالمی نوعیت کے جو حالات سیاست ومعیشت کے میدان میں رونما ہو رہے ہیں ان کو سمجھنا اور پھر ان کی روشنی میں قیادت مندانہ رول ادا کرنا بغیر اس موضوع کے تہہ تک پہنچے ممکن نہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر حمید اللہ کی تمام کتابوں میں نہایت اہمیت کی حامل ہے اور صحیح معنوں میں ان کے فکری افق، وسعت مطالعہ اور ان کے نظریہ ساز ذہن کی عکاس ہے۔

ڈاکٹر قطب سرشار۔ محبوب نگر تلنگانہ

غزل

ہوا کی سانس رُکی نبض موجِ بحر تھمی
حصارِ شہر میں ویران ہے ہر ایک گلی

یہ ساز و نغمہ و رقص جنون و بے خبری
فسادِ فکر و عمل ہے نشاطِ تیرہ شبی

زمین جب کہ ہے مِلکِ خدا فساد ہے کیوں؟
مسافروں میں زمین و مکان کی دُھن کیسی

کسی کی سوچ ہوئی اختراعِ جہل مبیں
کسی کا طرز ادا ہے تمام خوش طبعی

جبیں نوشتہ حرفِ گماں نہ ہو ورنہ
سکون چھین ہی لے گا نصیب تشنہ لبی

خدا کے دین پہ ہی انحصار کرتے رہیں
ہوس کی گود میں ہے عارضی ہر ایک خوشی

ہے انتہا نفس نکتہ چینی و شکوہ
قتیل حظّ انا ہے شعار خود نگہی

احمد نور عینی ۔پی ایچ ڈی اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

میرے پیارے ہم وطنو! آؤ دیش بچائیں!

جب سے شہریت ترمیمی بل راجیہ سبھا سے پاس ہوا ہے تب سے پورے ملک میں ہنگامۂ دار و گیر بپا ہے، یہ بل جس وقت صدر جمہوریہ کے دستخط سے قانون بنا اس وقت بھی پورا ملک صدائے احتجاج سے گونج رہا تھا۔اس قانون میں چوں کہ صرف مسلمانوں کا استثنا کیا گیا ہے اس لیے بہت سے لوگوں کا یہ تاثر ہے کہ یہ قانون صرف مسلمانوں کے خلاف ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، یہ قانون این آر سی سے مربوط ہے، اور این آر سی چور دروازے سے لائے جانے والے این پی آر سے مربوط ہے، اور سی اے اے+ این آر سی (این پی آر) ہمارے دیش کے سبھی باشندوں کے خلاف ہے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ آیئے اس کو قدرے تفصیل سے سمجھتے ہیں:

۱۔ یہ دیش کے تمام غریبوں کے خلاف ہے، خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اس سے سب سے زیادہ نقصان دیش کے غریب عوام کا ہوگا، خاص کر ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کے لوگوں کو بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، کاغذ کی سب سے زیادہ مشکلات غریب عوام کو ہوں گی، کیوں کہ ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کے پاس زمین ہی نہیں، اگر ہے تو زمین کے کاغذات نہیں، اگر کاغذات ہیں تو ان میں خرابی ہے، پیسے والے لوگ تو رشوت دے کر اور تعلقات کو ذریعہ بنا کر اپنا الو سیدھا کرلیں گے مگر یہ غریب دھکے کھاتے پھریں گے۔

۲۔ یہ دیش کے تمام باشندوں کے خلاف ہے، خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم؛ کیوں کہ کاغذات بنانا یا صحیح کرانا اور لائنوں میں لگنا یہ کام تو سب کو کرنا پڑے گا، نوٹ بندی کی لائنوں میں کھڑا ہونا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا مشکل کہ این آر سی کی لائن میں لگنا ہے، اور ان مشکلات سے مسلم و غیر مسلم سب کو گذرنا ہوگا۔

۳۔ یہ صرف مسلمانوں کے خلاف اس لیے بھی نہیں ہے کہ ڈیٹینشن سنٹر میں مسلمانوں کے علاوہ ایک اچھی خاصی تعداد میں غیر مسلموں کو بھی ڈالا جائے گا، اس کے پیچھے حکومت کے مختلف مقاصد ہوں گے، اس کے لیے حکومت غیر مسلموں میں سے ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کو استعمال کرسکتی ہے۔

۴۔ یہ صرف مسلمانوں کے خلاف اس لیے بھی نہیں ہے کہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد کو حکومت شہریت نہ دے کر کاغذ صحیح کرانے کے لیے پریشان کرسکتی ہے، جیسا کہ آسام میں کیا گیا، حکومت انھیں نہ شہریت دے گی نہ ہی ڈیٹینشن بھیجے گی، بل کہ بیچ میں لٹکا کر ایک عرصے تک پریشان کرے گی، اس جال میں خاص کر ان لوگوں کو پھنسانے کی کوشش کی جائے گی جو منو واد کے خلاف ہیں، خواہ وہ اونچی ذات کے سیکولر لوگ ہوں یا ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کے لوگ ہوں یا کمیونسٹ ہوں۔

۵۔ شہریت حاصل نہ کرنے والے غیر مسلموں میں سے ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوگی جنھیں حکومت یہ جتا کر شہریت دے گی کہ یہ اس کا احسان ہے، جب یہ بات ہوگی تو ان کی گردنیں احسان تلے جھک جائیں گی، اور زبانوں پر تالے لگ جائیں گے، اور پھر نہ تحفظات کی کوئی مانگ کرسکے گا نہ منو واد کی مخالفت میں کوئی زبان کھول سکے گا۔

۶۔ جو غیر مسلم این آر سی میں باہر آئے گا، اس کے

لیے سی اے اے کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کا ایک دروازہ تو کھلا ہوگا؛ لیکن یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ جو شخص بھی این آر سی سے باہر ہوگا تو وہ غیر قانونی شہری قرار پائے گا، جس کی وجہ سے اس کی منقول وغیر منقول جائیداد ضبط کرنے کا حق حکومت کو حاصل ہوگا، اب جب سی اے اے کے ذریعہ اسے دوسرے دروازے سے لایا جائے گا تو اسے صرف شہریت دی جائے گی، جائیداد لوٹانا یا نہ لوٹانا حکومت کی صواب دید پر ہوگا، یہاں چت بھی حکومت کی ہوگی پٹ بھی حکومت کی ہوگی، جائیداد واپس کرے تو بھی حکومت کا فائدہ کہ احسان جتلا کر کام نکالے گی اور اگر جائیداد واپس نہ کرے تو بھی حکومت کا فائدہ ہے۔

۷۔ این آر سی سے باہر آنے والے غیر مسلموں کے لیے سی اے اے کے ذریعہ شہریت حاصل کرنا ممکن تو ہے؛ لیکن یہ قانون چوں کہ پڑوس کے تین ملکوں کی اقلیتوں کے لیے ہے، یعنی باہری لوگوں کے لیے ہے؛ اس لیے این آر سی میں خارج ہونے والا غیر مسلم جب سی اے اے کے ذریعہ شہریت حاصل کرے گا تو بہ حیثیت غیر ملکی مہاجر کے شہریت دی جائے گی، ظاہر سی بات ہے کہ یہ ایک ہندوستانی کی عزت نفس کے خلاف ہے کہ جس ملک میں اس نے اور اس کے آبا واجداد نے اپنی پوری زندگی گذاری اسی ملک میں اسے غیر ملکی کی حیثیت سے شہریت تسلیم کرنی پڑ رہی ہے، دوسرے یہ کہ جب کسی غیر مسلم بھارتی کو سی اے اے کے ذریعہ غیر ملکی پناہ گزین کے طور پر شہریت دی جائے گی تو چاہے وہ ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کا کیوں نہ ہو اسے جنرل کیٹگری کی شہریت دی جائے گی۔

۸۔ یہ قانون صرف مسلمانوں کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ سی اے اے کے ذریعہ جو شخص ہندوستانی شہریت حاصل کرنا چاہے گا اسے اپنے آپ کو کاغذی طور پر غیر ملکی ثابت کرنا ہوگا، وہ اگر واقعی غیر ملکی ہوگا تو اسے مشکل تو ضرور ہوگی مگر اس کے لیے غیر ملکی ثابت کرنا ناممکن نہیں ہوگا؛ لیکن اگر این آر سی میں چھٹ جانے والا ہندوستانی ہوگا، تو وہ غیر ملکی ہونا کہاں سے ثابت کر پائے گا، وہ تو حکومت کے رحم وکرم پر ہوگا، سنگھی حکومت کے رحم وکرم پر ہونے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے ہر بابصیرت شخص سمجھ سکتا ہے۔

۹۔ این آر سی اور سی اے اے کی گوٹیاں سیٹ کر کے منووادکی مخالفت کرنے والوں یعنی ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کے خلاف ایک بڑا کھیل یہ کھیلا جائے گا کہ تحفظات ختم کر دیے جائیں گے، ان کو جب شہریت دی جائے گی جو جنرل کیٹیگری کی شہریت دی جائے گی، اور یہ لوگ بھی سوچیں گے کہ شہریت نہ ملنے سے جنرل کیٹیگری کی شہریت لے لینا لاکھ گنا بہتر ہے۔ اس طرح سنگھ واد کا تیر اپنے نشانے پر جا لگے گا۔

۱۰۔ سی اے اے اور این آر سی یا این پی آر کا یہ پورا کھیل منووادا ور سنگھ واد کو لانے کے لیے کھیلا جا رہا ہے، جس کا اظہار خود ان کے حلقہ کی ہی بعض شخصیتوں نے کیا ہے، این آر سی سے مسلمانوں کو باہر کر دیا جائے گا تو ان کے پاس ڈیٹینشن اور شہادت کے سوا کوئی آپشن نہیں ہوگا، اب رہ گئے ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کے لوگ تو انھیں اوپر ذکر کیے گئے طریقوں کے مطابق جال میں پھنسایا جائے گا، یہ بھی واضح رہے کہ سنگھ کے ایجنڈے میں مسلمانوں کے علاوہ دو طبقے اور ہیں جن پر آگے چل کر قافیہ تنگ کیا جائیگا، اور وہ ہیں کمیونسٹ اور عیسائی، ہوسکتا ہے کہ کمیونسٹوں کی ایک بڑی تعداد سے بھی یہ لوگ اسی این آر سی ہی میں نمٹ لیں۔

یہ ایک مختصر سا تجزیہ اس بات کو بتانے کے لیے ہے کہ سی اے اے اور این آر سی یا این پی آر صرف مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے؛ بل کہ دیش میں بسنے والے تمام باشندوں کے خلاف ہے، اس کا نقصان پورے دیش کو اور دیش کے تمام

باشندوں کو بھگتنا پڑے گا۔ آخر میں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حکومت نے این آر سی کیخلاف ہونے والے ہنگاموں کو دیکھ کر این پی آر لانے کی بات شروع کی ہے، این پی آر اپنی موجودہ شکل میں این آر سی کا ہی کام کرے گا یا کم از کم این آر سی کی راہ ہموار کرے گا، این پی آر دراصل این آر سی کا پہلا مرحلہ ہے، اس کی وضاحت وزارت داخلہ کی طرف سے شائع ہونے والی 2019-2018 کی سالانہ رپورٹ کے صفحہ 262 پر کی گئی ہے۔ لہذا اوپر جو باتیں این آر سی کے تعلق سے لکھی گئی ہیں وہ تمام باتیں این پی آر پر بھی منطبق ہوتی ہیں، اس لیے کسی طرح کا کنفیوژن نہیں ہونا چاہیے۔

اس پوری تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم دیش کو اور دیش کے دستور کو اور سیکولر ڈھانچے کو بچانا چاہتے ہیں تو این آر سی اور این پی آر کا بائیکاٹ کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

ہم دیکھیں گے

فیض احمد فیض

ہم دیکھیں گے
ہم دیکھیں گے، ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل پہ لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی

ہم دیکھیں گے
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اُٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ سفا مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

ہم دیکھیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو ناظر بھی ہے منظر بھی
اٹھّے گا انا الحق کا نعرہ
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
ہم دیکھیں گے!!!

محمد شاکر ۔ریسرچ اسکالر یونی ورسٹی آف حیدرآباد

سائنٹیفک سوسائٹی سرسید احمد خان کی ایک قابل فخر کارنامہ

سرسید احمد خان کی ذات گرامی عظیم تہذیبی کارناموں کا سرچشمہ تھی۔ان میں سے کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت دینا بڑا مشکل ہے۔علم وادب کا میدان ہو یا تعلیم وتربیت کی جولا گاہ۔سیاست و معیشت کی راہیں ہوں یا الٰہیات واخلاقیات کے راستے ہر جگہ سرسید احمد خان کا اشہب کردار اردو سبک سیری دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔تاریخ تہذیب انسانی میں اس کے لئے ہمہ گیر کردار کی شخصیتیں ملنی محال ہیں۔سرسید احمد خان کی ذات انجمن در انجمن کی مثال تھی۔انھوں نے ایوان زندگی میں ایک نہیں متعدد محفلیں آراستہ کیں۔یہ اسی بطل جلیل کا فیضان نظر ہے کہ اس کی سجائی ہوئی محفلوں میں ایک چراغ بجھنے آیا تو کئی چراغ خود بخود فروزاں ہو گئے۔

سرسید احمد خان کی سجائی ہوئی ایسی ہی محفلوں میں سے ایک محفل سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ بھی تھی۔اس کی زمانہ شناس نظریں دیکھ رہی تھیں کہ مغربی علوم وفنون عالمگیر حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں۔اور آئندہ وہی قوم سربلندی اور سرخ روئی حاصل کر سکے گی جو جدید علوم وفنون سے مرصع ہو کر آگے بڑھے گی۔بصورت دیگر محکومی انفعالیت اور زبوں حالی اس کا مقدر ہو گئی۔

سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام:

برصغیر میں عوام اور مسلمان خاص طور پر انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بنا پر جدید علوم وافکار سے بے بہرہ تھے۔ان کے لئے ضروری تھا کہ یا تو وہ انگریزی زبان سے ناواقفیت کو ختم کریں یا ان کے لئے مختلف علوم وفنون اور افکار تازہ کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا جائے۔اور ضرورت درحقیقت دونوں ہی باتوں کی تھی۔پہلے مقصد کے حصول کے لئے سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔لیکن وہ صرف اسی بات پر قناعت نہ کر سکتے تھے کہ مغربی علوم و فنون انگریزی کے ذریعہ حاصل کئے جائیں۔وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھے کہ کسی غیر زبان کو سیکھنے میں عمر کا ایک بڑا حصہ گنوا کر کسی علم یا فن میں کمال بہم پہنچانا اور مہارت تامہ حاصل کرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے ورنا کیولر یونی ورسٹی کا منصوبہ بنایا۔جہاں تمام علوم وفنون کی تدریس اردو زبان میں دی جاسکے۔لیکن افسوس کہ مصلحت کوش انگریز حکام کی سرد مہری اور بے اعتنائی کی وجہ سے وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے قاصر رہے۔لیکن سرسید احمد خان اس منصوبے کو عمل میں لانے کے بارے میں برابر سوچتے رہے۔

1863ء میں سرسید احمد خان نے اپنی ایک تحریک کے ذریعہ ایک ایسی مجلس کے قیام پر زور دیا جو مشرق کے قدیم مصنفین کی بلند پایہ اور انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی جستہ جستہ کتابوں کا ترجمہ کروا کر شائع کرے۔یہی تحریر آگے چل کر سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد بن گئی۔چنانچہ اگلے سال یعنی 9 جنوری 1864ء کو غازی پور میں سرسید احمد خان اور ان کے ایک انگریزی دوست لیفٹیننٹ کرنل گریہم نے ایک جلسے میں اپنی موثر اور مدلل تقریروں کے بعد اس سوسائٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔اس جلسہ کی قرارداد میں سرسید احمد خان نے اپنی سوسائٹی کے اغراض ومقاصد واضح کرتے ہوئے بتایا کہ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام انگریزی میں موجود علمی اور تاریخی کتابیں اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کی جائیں گے تاکہ مغربی علوم وفنون کی طرف اہل وطن مائل ہوں۔علمی موضوعات پر لیکچر دیئے جائیں گے۔ایک اخبار بھی جاری کیا جائے گا جو حکومت اور رعایا کے درمیان افہام وتفہیم کا ایک ذریعہ ہوگا۔یہ اخبار اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوگا۔اخبار کے لکھنے والوں میں انگریز،مسلمان،ہندو تینوں قوموں کے افراد شامل ہوں گے۔اس اخبار کے ذریعے انگریز حکومت۔انگریزوں اور ہندوستانی عوام کے

درمیان مغائرت، علٰحدگی، عدم اعتماد اور مذہبی تعصّبات کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

6، جون 1846ء کو سرسید احمد خان کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوگیا اور چونکہ ان کی عدم موجودگی میں غازی پور میں سوسائٹی کا صحیح خطوط پر چلنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ان کے ساتھ سوسائٹی کا تمام سامان اور عملہ بھی علی گڑھ پہنچ گیا۔

سوسائٹی کا دستور 1864ء میں بمقام غازی پور مرتب ہوا تھا تاہم 1866ء میں اس میں معمولی سی ترمیم کی گئی۔ اسی سال سوسائٹی کے لئے ایک عمارت بھی تقریباً تیس لاکھ کی لاگت سے تیار ہوگئی۔ میرٹھ کے کمشنر مسٹر ولیمس نے اس عمارت کا افتتاح کیا ڈیوک آف آرگائل وزیر ہند اس کے سرپرست اور ڈری فنڈ لیفٹننٹ گورنر شمال مغرب نائب سرپرست مقرر ہوئے جب کہ لیفٹننٹ کرنل گریہم کو سوسائٹی کا اولین معتمد بنایا گیا۔ بعد کو سرسید احمد خان اس عہد پر فائز ہوئے۔ سرپرست اور نائب سرپرست کے علاوہ جو عہدے مقرر کئے گئے وہ اراکین معاون (حضوری) اراکین معاون (مکاتیبی) اراکین اعزازی اور رفقائے سوسائٹی کے تھے۔ مزید برآں کونسل مشیر اور کارپرداز بھی مقرر کئے گئے۔ سوسائٹی کی تعمیر کردہ عمارت کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ رکھا گیا تھا اور اس میں ایک عجائب گھر کا بھی اہتمام کیا گیا جس کا مقصد ہر قسم کی عجیب و غریب چیزیں جمع کرنا اور علمی آلات اور مختلف کلوں کے نمونے فراہم کئے گئے۔ تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔ ڈاکٹر کلکلی ہر مہینے طبیعاتی سائنس کے موضوع پر تقریر کرتے تھے اور علمی آلات کی مدد سے حاضرین کو تجربے دکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ گیہوں کی فصل نہایت امید افزاء نتائج کے ساتھ تیار کی گئی۔ ان تجربات میں سرسید احمد خان خود بھی دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے ایک آہنی تلی بھی ایجاد کی تھی جس کے ذریعہ گیہوں کا ایک ایک دانہ بویا جاتا تھا۔

سائنٹیفک سوسائٹی کی علمی خدمات:

سائنٹیفک سوسائٹی کے ذریعہ سرسید احمد نے لوگوں کے اندر سائنسی طرزِ فکر اور عقلیت و حقیقت پسندی کا رجحان پیدا کیا۔ اور توہم پرستی سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے سائنسی علوم کی روشنی میں مذہب کو سمجھنے سمجھانے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ سرسید بڑے دوراندیش اور زمانہ شناس تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم خصوصاً جدید تعلیم عام نہ ہوگی تو وہ نہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے واقف ہوسکیں گے اور نہ ان کے اندر ملک اور معاشرے کے بدلے ہوئے تقاضوں کے مطابق تمام اہم مسائل کو بحسن و خوبی حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوسکے گی۔ اس لیے انھوں نے مغربی علوم وفنون کی اشاعت کو انگریزی تعلیم سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم قرار دیا۔ اس زمانے میں مسلمان انگریزی پڑھنا گناہِ کبیرہ سمجھتے تھے۔ اور دوسری قوموں کے لیے بھی اس میں کوئی خاص کشش نہ تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی طرف راغب ہوتیں۔ کیوں کہ تمام عدالتوں میں اردو زبان کا رواج تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ جو اس وقت کسی ہندوستانی کو مل سکتا تھا۔ اس کے لیے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔

سرسید مغربی علوم وفنون کی تعلیم کی اشاعت اس لیے بھی ضروری سمجھتے تھے۔ کہ اس سے حاکم ومحکوم یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں کے نظریات وخیالات میں اتفاق واتحاد اور یگانگت و قربت پیدا ہوگی۔ جس سے نہ صرف انگریزوں کو فائدہ پہنچے گا۔ بلکہ ہمارے وطن کے بھائی بھی مستفیض ہوں گے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز جیسے طاقت ور قوم سے براہِ راست ٹکر لینا ہوا میں ہاتھ مارنے کے مترادف ہوگا۔ انہیں انہی کے ہتھیاروں سے شکست دی جاسکتی ہے جس سے لیس ہوکر وہ ہندوستان آئے تھے۔

سرسید احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی کے دو اہم مقاصد قرار پائے۔

(۱) ان علوم وفنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان یا یورپ کی کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے۔ ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

(۲) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کامیاب اور نفیس کتابیں تلاش کرکر کے بہم پہنچانا اور شائع کرنا۔

سائنٹیفک سوسائٹی ہندوستان کا تیسرا وقیع اور قابلِ تقلید تصنیفی وتالیفی اور اشاعتی ادارہ تھا۔ جو سرسید احمد خان کی فکر رسا کے

نتیجہ کے طور پر معرضِ وجود میں آیا۔ اس سے قبل فورٹ ولیم کالج انگریزوں نے قائم کیے تھے۔ دلی کالج کی ٹرانس لیشن سوسائٹی اور سائنٹفک سوسائٹی کا مقصد دیسی زبانوں میں مغربی ومشرقی علوم و فنون کی کتابوں کی طباعت واشاعت تھا۔اور اس میدان میں دلی کالج نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ سائنٹفک سوسائٹی نے پندرہ علمی کتابیں تالیف یا ترجمہ کر کے اردو کے خزانے کو مغربی علوم وفنون سے مالا مال کیا۔اس کے ساتھ ہمارے ان کاموں کے لیے جو مغربی علوم سے ناواقفیت کی بنا پر رکے ہوئے تھے، راہ ہموار ہوگئی۔

مولانا الطاف حسین حالؔی سوسائٹی کی اس افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اگر غور سے دیکھئے تو یہ سوسائٹی ہمارے ان مقاصدِ جلیلہ میں سے ہے۔جن کے حاصل ہونے کی توقع ہم کو اس سے پہلے گورنمنٹ کے سوا کسی سے نہ تھی۔اور جن پر ہمارے وہ کام اٹکے ہوئے ہیں۔جن کے نہ ہونے سے ہم پر انسان بالفعل کا اطلاق اب تک صحیح نہیں ہوا''۔

سوسائٹی نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے حواشی میں متن کے بعض الفاظ اور اشارات واصطلاحات کی تشریح وتوضیح کا التزام کیا گیا ہے، جن سے ہندوستانی عام طور سے ناواقف ہوتے تھے۔سوسائٹی کی کتابیں تعداد کے لحاظ سے کم ہیں لیکن کیفیت کے اعتبار سے غیر معمولی افادیت و اہمیت کی حامل ہیں۔ان تصانیف نے انیسویں صدی میں شمالی ہند میں جدید تعلیم کی تشویق وترغیب میں دمِ عیسیٰ کا کام کیا۔

سوسائٹی کے اجلاسوں میں عورتوں کی تعلیم وتربیت پر بھی زور دیا گیا۔اگرچہ کہ اس زمانے میں سوسائٹی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔لیکن اس کی اس ہوشمندانہ تبلیغ کا نتیجہ ہم آج انہیں آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔اس کے علاوہ سوسائٹی نے کسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کوشش کیں۔اس نے نہ صرف علمِ فلاحت پر کتابیں تصنیف کرائیں۔بلکہ اس کی نگرانی میں کاشتکاری سے متعلق مختلف علمی تجربے بھی کیے گئے۔

اس طرح سوسائٹی کی قیادت نے ہماری زبان کے علمی ذخیرے میں قابلِ ذکر اضافے کے ساتھ ساتھ ملک میں جدید خیالات کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا۔اس کی کوششوں کی بدولت سائنس سے دلچسپی کا رجحان عام ہوا اور ہمیں علمی معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے ترقی کی نئی راہ میں، ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی میں سوسائٹی کی خدمات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ سائنٹفک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔لیکن انھوں نے صرف اکتیس کتابوں کے نام گنائے ہیں۔ڈاکٹر اصغر عباس کی تحقیق کے مطابق سوسائٹی نے صرف پندرہ کتابیں شائع کیں۔جن کے نام اس طرح ہیں۔مصر کی قدیم تاریخ، تاریخ چین، یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ، رسالہ علمِ فلاحیت، رسالہ علمِ انتظام مدن، تاریخ ہندوستان، رسالہ علمِ برقی، اصولِ سیاست مدن، تاریخ ایران، رسالہ علمِ جغرافیہ، رسالہ نیچرل فلاسفی، رسالہ علمِ آب وہوا، رسالہ جرثقیل وغیرہ۔

سوسائٹی کے اخبارات سے پہلے ہندوستانی اخبارات محض قارئین کی تفریحِ طبع اور دل لگی کا ذریعہ سمجھے جاتے تھے۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اپنے پیش رو اخباروں کے اس انداز و روایات سے ہٹ کر صفحات کا ایک نیا معیار قائم کیا اور صحیح خبروں کے پہلو بہ پہلو علمی، تہذیبی، سیاسی اور اخلاقی مضامین شائع کر کے اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی اور ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔سوسائٹی کی کتابوں اور اس کے اخبار کی تحریروں سے ہندوستانیوں کے اذہان و افکار میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔انگریزوں کا جو رعب اور خوف ہم پر طاری تھا۔وہ رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا اور ہمیں بدلے ہوئے ماحول اور معاشرے میں سانس لینے کا ایک انداز نصیب ہوا۔

مولوی عبدالحق نے ایک جگہ سوسائٹی کے قیام کے ان اثرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیمی وعلمی تھا۔اور اس کا ایک جزو سائنٹفک کا قیام تھا خود یہ نام اس تغیر کی خبر دے رہا تھا جو اس وقت عمل میں آرہا تھا''۔

ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا۔کلکتہ

شاہ کا فرمان

سنا ہے شاہ کا فرمان پھر سے آیا ہے
سنا ہے آج بھی غدار ہم ہی ٹھہرے ہیں
ہمیں رہے ہیں محافظ یہاں کے پھولوں کے
سنا ہے آج خطاکار ہم ہی ٹھہرے ہیں
سنا ہے قفل بھی ڈلوا دیے ہیں ہونٹوں پر
سنا ہے حکم ملا ہے زبان بندی کا
سنا ہے آنکھوں پہ پہرے بھی لگ گئے ہیں اب
سنا ہے اذن بصارت یہاں کسی کو نہیں
سنا ہے گوش سماعت سے کردیا محروم
سنا ہے اذن سماعت یہاں کسی کو نہیں
مگر جو چاہے کہ سن لے جناب من کی بات
خوشی سے موقع اسے دیں گے وہ سماعت کا
سنا ہے شاہ کی ہاں میں جو ہاں ملائے گا
ملے گا تحفہ اسے ہر جگہ صدارت کا
جو سچ کو دیکھ کے آنکھیں کریگا اپنی بند
سنا ہے دان وہ دیں گے اسے بصارت کا
سنا ہے اندھوں کو ایوارڈ ملنے والے ہیں
سنا ہے بہروں کو تمغے لگائے جائیں گے
سنا ہے گونگوں کی ٹولی بنائے جائے گی
ہر اک مقام پر ان کو بٹھایا جائے گا
سنا ہے ان سے گواہی دلائی جائے گی
سیہ سفید کی دوری مٹائے جائے گی
سنا ہے یہ بھی ہے منصوبہ شاہ دوراں کا
ہرایک پیڑ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے
وہ پیڑ چاہے ثمربار ہوکہ سایہ دار
جو ان کی راہ میں آئے اکھاڑ پھینکیں گے
سنا ہے شاخیں جو روکیں گی ان کی راہوں کو
انہیں بھی تیز کٹاروں کی زد میں لائیں گے
نہیں وہ چھوڑیں گے پتوں کو پھولوں کلیوں کو
انہیں بھی نفرتی آندھی سے یہ اڑائیں گے
مگر اے باد صبا ان کو یہ پیام تو دے
جو حریت کا نشہ چھا گیا ہے محفل میں
اسی کا ذائقہ چکھ لیں وہ ان کو جام تو دے
انہیں بتا دے بصارت سے ہم نہیں محروم
نہ ہم نے اپنی سماعت ہی گروی رکھی ہے
انہیں یہ کہہ دے زباں ہے ہمارے منہ میں ابھی
جو لب کو کھول دیں پردوں میں ارتعاش کریں
زباں کی دھار سے پتھر میں ہم شگاف کریں
ہمیں نہ جان کی پروا نہ خوف دارورسن
ہمیں تو جان سے پیارا ہے اپنا پیارا وطن
یہ احتجاج ہمارا ہے شاہ سن لو تم
تمہارا حکم نہ مانیں گے شاہ سن لو تم
جو زرخرید تمہارے ہیں وہ رہیں گے چپ
ہم انقلاب بھی لائیں گے شاہ سن لو تم
ہمیں ہے جان سے پیارا ہمارا یہ دستور
تمام جگ سے ہے نیارا ہمارا یہ دستور
یہ احتجاج ہمارا ہے اس کو درج کرو
بشکل نظم یہ نعرہ ہے اس کو درج کرو

اُویس احمد بٹ۔ پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد

صالحہ صدیقی اور ''ڈرامہ علامہ'': ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈرامہ ایک ایسی صنف ہے جس میں انسان کی نقل کی فطرت اور تخیل و تخلیقیت کے امتزاج سے کرداروں اور واقعات کی توضیع اور تشکیل کی صلاحیت کا بھرپور استعمال ہوتا ہے۔ایک ڈرامہ نگار کسی شخص کے حرکات وسکنات، خیالات و جذبات یا اس کے ساتھ پیش آئے حادثات و واقعات کو اپنے ڈرامہ میں پیش کرتا ہے۔اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کرداروں کے ذریعے ہو بہو نقل کرکے اور واقعات کے اُتار چڑھاؤ کو اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے یا سننے والے کو کسی بھی کردار یا واقعہ (حقیقی یا فرضی) سے متعلق ڈرامہ نگار کی فنکارانہ مہارت سے سارا ماجرا آنکھوں کے سامنے گذرتا ہوا نظر آجائے۔ڈرامہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ڈرامہ کے پس منظر میں حقیقی واقعہ کا ہونا لازم ہے یا اس میں پیش کیے جانے والے کردار حقیقی ہوں بلکہ ڈرامہ نگار ایک موضوع طے کرکے اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر منتخب شدہ موضوع کی مناسبت سے واقعات اور اس واقعہ میں کام آنے والے افراد (کردار) کی تخلیق کرتا ہے۔پھر ایک ڈرامہ کی صورت میں ڈرامہ نگار اپنی فنی مہارت سے کرداروں کی زبان اور حرکات وسکنات سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ حقیقت کی نقل ہوتے ہوئے بھی حقیقت ہی معلوم ہوجاتی ہے۔اسی طرح صالحہ صدیقی کا ڈرامہ ''ڈرامہ علامہ'' ایک قابل تحسین ڈرامہ ہے۔جو شاعر مشرق علامہ اقبال کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ پر مبنی ہے۔اس ڈرامہ میں خصوصاً علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی کے مدوجزر کو نہایت ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ڈرامہ 'علامہ' صالحہ صدیقی کی خلاقانہ صلاحیتوں کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

ڈرامہ 'علامہ' پہلی بار ۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے بعد ۲۰۱۶ء میں اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع ہوا۔اکتاب کا دیباچہ مرزا حامد بیگ نے تحریر کیا ہے جس میں اُنھوں نے مصنفہ کو سراہتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈرامہ 'علامہ' تحقیقی اعتبار سے بھی درست ہے اور تخلیقی اعتبار سے بھی اپنی اہمیت کا حامل ہے۔کتاب کی تقریظ ڈاکٹر طاہر حمید تنولی نے لکھی ہے۔تنولی صاحب نے مصنفہ کی فنی صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ علامہ کی زندگی کے اہم گوشوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے علامہ کی شاعرانہ عظمت اور اُن کی شاعری کی کیفیت وروح کو بھی ملحوظ نظر رکھا ہے جو مصنفہ کے تخلیقی ذہن کی پختگی کا ثبوت دیتا ہے۔

ڈرامہ کے پیش لفظ میں مصنفہ نے شروع میں اردو زبان کی دلکشی و خوبصورتی کی طرف انگشت نمائی کرکے عہد حاضر میں اردو زبان کی لڑکھڑاتی ٹانگوں کو دیکھ کر اس کی شکستہ حالی کی طرف بھی ایک خفیف اشارہ کیا ہے۔اُنھوں نے نئی نسل کی اردو زبان کے تئیں عدم دلچسپی کو ذاتی مشاہدے کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بہ ذات خود اردو درس وتدریس سے منسلک افراد خود کو اردو زبان کے خیر خواہ بولنے والے اپنے بچوں کو اردو زبان سے کوسوں دُور رکھے ہوئے ہیں۔وہ نئی نسل کو اردو کی خوبصورت وراثت سے سرفراز کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ڈرامہ 'علامہ' چوں کہ علامہ اقبال کی زندگی کے ایک ایسے حصے پر مبنی ہے جو اُن کے ذہنی کشمکش وتصادم، تناؤ بھری زندگی اور احساس تنہائی خصوصاً اُن کی ازدواجی زندگی میں پیش آئے مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔مصنفہ نے درپردہ اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یوں تو علامہ اقبال پر ہندوستان و پاکستان کے علاوہ بقیہ ممالک اور بیشتر زبانوں میں اُن کے کلام کے تعلق سے نہایت ہی باریک بینی اور تفصیل سے کام کیا گیا ہے لیکن ''ان کی شادی شدہ زندگی کے تانے بانے میں بے شمار جہتیں تھیں جن کی طرف کم توجہ دی گئی ہے۔'' (پیش لفظ، ص،۹)۔مصنفہ کے مطابق علامہ نے اپنی

شادی شدہ زندگی میں خوشیاں کم اور دُکھ درد اور تنہائی کا عالم زیادہ دیکھا ہے۔تین بیویاں ہونے کے باوجود بھی اُن کے دل و دماغ سے تنہائی اور غم کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔مصنفہ نے علامہ کی زندگی کے حوالے سے اُن کے احساس غم اور تنہائی کے درد کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''۔۔۔علامہ اقبال بلاشبہ ایک عظیم شخصیت کے مالک ، خداد صلاحیتوں کے مالک، ایک لافانی شاعر تھے۔لیکن بالآخر وہ ایک انسان بھی تھے،جن کے سینے میں دل دھڑکتا تھا،جن کی اپنی ایک زندگی تھی،اور اس زندگی کے سفر کو طے کرنے کے لیے ایک مخلص، ایک ہمدرد، ایک دوست ایک ساتھی، ایک غمگسار کی ضرورت تھی جوان کے دل میں اُٹھتے پوشیدہ جذبات کو سمجھ سکے،اُن کے احساسات کو محسوس کر سکے،اُن کے اس درد کو جذب کر سکے جسے وہ دُنیا میں کسی کے ساتھ بھی نہ بانٹ سکتے ہوں۔''(ایضاً،ص،۹)۔

علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی بھی ایک ڈرامائی صورتحال اختیار کر چکی تھی۔علامہ کی زندگی کے اسی حصے کو مصنفہ نے ایک ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ڈرامہ''علامہ'' کی غرض و غائیت کو بیان کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں۔

''علامہ اقبال کی زندگی کے اسی رُخ کو اس ڈرامے(علامہ) میں پیش کیا گیا ہے۔جہاں ایک طرف وہ شہرت و بلندی کے آسمان کو چھو رہے تھے،آپ پر انعامات کی بارش ہو رہی تھی تو دوسری طرف اپنی ذاتی زندگی میں کشمکش وتصادم میں مبتلا تھے،ایک خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ان کے اسی جذبات و احساسات کی عکاسی اسی ڈرامے کے ذریعے کرنے کی سعی کی گئی ہے۔''(ص،۱۱)۔

کتاب کے پہلے ایڈیشن میں''چند باتیں'' کے عنوان سے محمد سراج کی تحریر بھی شامل ہے جس میں اُنھوں نے اقبالیات پر اب تک کے کام کا ذکر کرتے ہوئے صالحہ صدیقی کو ڈرامہ'علامہ'' تحریر کرنے پر سراہا ہے۔اُنھوں نے مصنفہ کو اقبال کے اندرونی کرب، ازدواجی زندگی کے المیے اور اُن کی زندگی کی اُتھل پُتھل کو حسین پیرائے میں ڈرامہ کی صورت میں پیش کرنے کو اردو ادب میں اقبالیات کے حوالے سے ایک اچھوتا کام قرار دیا ہے۔وہ مصنفہ کے اس کام کو سراہتے ہوئے اپنے تاثرات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''۔۔۔صالحہ صدیقی نے علامہ اقبال کی زندگی کے ایک ایسے پہلو پر اپنے(اپنی؟) قلم کو جنبش دی ہے جس پر اچھے اچھے اقبال شناسی کے صاحب قلم حضرات لکھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔۔۔لیکن صالحہ نے شاعر مشرق کی زندگی کے اس اَن چھوئے پہلو پر تنقید و تنقیص کے بجائے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان پر''علامہ'' کے نام سے ڈرامہ تشکیل دیا ہے جو یقیناً اقبالیات میں ایک خوشگوار اضافہ ہوگا۔۔۔میری ناقص رائے میں شاعر مشرق کے تعلق سے یہ ایک بالکل اچھوتا کام ہے۔''(ص،۲۵)۔

خیر مصنفہ کا یہ کام سراہنے کے قابل بھی ہے کیوں کہ اُنھوں نے علامہ کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو ایک ایسی صنف کا سہارا لے کر پیش کیا ہے جس کی طرف عہد حاضر میں خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔یوں تو غالب اور منٹو پر ڈرامے لکھے اور فلمائے گئے ہیں، یہاں تک کہ کئی اردو ناولوں کو ڈرامائی شکل میں پردے پر دکھایا بھی گیا ہے،لیکن ابھی تک ماہرین اقبالیات اس طرف توجہ نہیں دے سکے کہ علامہ جیسے بڑے شاعر و دانشور کی زندگی کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا جائے تا کہ جو کچھ ہم علامہ کے حوالے سے پڑھتے آئے ہیں اُس کا ایک حقیقی رُخ بھی ڈرامہ کے ذریعے دکھایا جائے۔صالحہ صدیقی نے یہ کام کر کر دکھایا اور علامہ کی زندگی کے اہم گوشوں کو ڈرامائی صورت میں پیش کر کے اقبالیات میں ایک اہم کام کا اضافہ کیا ہے۔

ڈرامہ'علامہ' میں کل سات مناظر اور ۱۹ کردار ہیں۔ جس میں علامہ،علامہ کی تین بیویاں،کریم بی،سردار بیگم اور مختار بیگم، علامہ کے عزیز دوست واحباب عبدالقادر سرور،بشیر حیدر،دانش احمد، چودھری محمد حسین اور شیخ گلاب دین وکیل،۵ انگریز،علامہ کے خادم علی بخش، ڈاکیہ،حکیم اور علامہ کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے والی مسز ڈورس احمد اور علامہ کو گمنام خط لکھنے والے بدمعاش جلیل اور اس کے چار ساتھی شامل ہیں۔مضمون کے شروع میں ہی مذکوہ ہو چکا ہے کہ علامہ کی ازدواجی زندگی میں بہت کشمکش رہی ہے جس کی وجہ سے اُنھیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ڈرامہ کا پہلا منظر

ہی علامہ کی پہلی بیوی کریم بی کے ساتھ تو تو میں میں سے شروع ہوتا ہے۔ چوں کہ کریم بی گجرات کے ایک بڑے اور امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ شادی سے پہلے باورچی خانے میں قدم بھی نہیں رکھی تھیں مگر علامہ کے یہاں اُنھیں یہ کام بہت ناگوار گذرتا ہے اور ضد پر اڑی رہتی ہے کہ علامہ باہر ہوٹل سے کھانا منگوائے۔ اپنے خاندان کی ٹھاٹ بھاٹ کریم بی اس طرح بیان کرتی ہے:

''میرا تو دم گھٹتا ہے، باورچی خانے کے دھوئیں میں، آپ کے ساتھ بندھ کر میں اپنے دیدے بھوٹ رہی ہوں۔ گجرات کے عطا محمد خان کی بیٹی جس کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے باندیاں لگی رہتی تھیں، آج اسی کے ہاتھوں پر پھپھولے پڑ رہے ہیں، روٹیاں سینک سینک کر۔'' (ص،۸۵)

مشرقی نظام فکر میں ایک بیوی کا اپنے شوہر کی اطاعت مسلم ہے جس کے ساتھ سمجھوتا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ایک مشرقی تہذیب میں قطعی یہ زیب نہیں دیتا کہ گھر میں عورت ہے، جو کہ اپنے شوہر کے لیے کھانا بنانے کی حالت میں ہے مگر اپنے میکے کی ٹھاٹ بھاٹ کے پیش نظر کھانا پکانے سے انکار کرے۔ مذکورہ منظر میں علامہ اپنی بیوی کو مشرقی فکر کا اعادہ کرتے ہوئے ایک بیوی کا اپنے شوہر کے تئیں فرض کو ذہن نشین کراتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی کریم بی اپنی بات پر قائم رہتی ہے کہ کھانا باورچی کھانے میں نہیں پکے گا بلکہ باہر ہوٹل سے آئے گا۔ مذکورہ منظر میں کریم بی علامہ کی شاعری اور اُن کی ادبی زندگی پر سخت چوٹ کرتی ہے۔ مثلاً:

''جب دیکھو اپنی شاعری میں مگن رہتے ہیں''۔۔۔''یہ بھی کوئی مردوں والا کام ہوا؟۔۔میں نے کتنی بار سمجھایا کہ کوئی ڈھنگ کا کام کیا کرو، شاعری سے کیا بھلا ہوگا۔'' (ص ۸۷)

اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ علامہ کی ازدواجی زندگی میں کس طرح شروع سے ہی کشمکش رہی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی شاعری کو لے کر بھی بہت چوٹ کی گئی ہے۔ پہلے منظر میں علامہ اور کریم بی کے علاوہ علامہ کے عزیز دوست عبدالسرور کے درمیان گفتگو ہورہی ہے۔ اسی منظر میں علامہ کی پہلی بیوی باورچی خانے میں کھانا نا پکانے کی وجہ سے اپنے میکے گجرات چلی جاتی ہے۔ یہاں پر علامہ تنہا رہ جاتے ہیں۔ مصنفہ کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے بہترین پیرائے اظہار میں علامہ کی زندگی کے اس حصے کو ایک ایسی صنف کی صورت میں پیش کیا ہے جس سے پڑھنے یا سننے والے کے ذہن میں ایک حقیقی واقعہ کی چھاپ پڑ جاتی ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ واقعہ مکمل طور پر حقیقت پر مبنی ہے، مگر پھر بھی مصنفہ نے اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے منظر کشی اور جذبات نگاری کے ساتھ نہایت ہی حسین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ علامہ اور کریم بی کے مابین جو مکالمہ بازی ہوئی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ مصنفہ نے مکالمے میں ایک شوہر اور بیوی کے رشتے کی باریکیوں کو خیال رکھتے ہوئے مکالموں کا انتخاب کیا ہے، جو اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا کمال ہے۔ یہاں پر ایک مثال کے طور پر ایک مکالمے کی باریکی پیش کرنا چاہوں گا کہ جب کریم بی غصے کی حالت میں اپنے میکے جانے کی ضد کرتی ہے تو علامہ کریم بی کو نام یعنی ''کریم بی'' سے پکارتے ہیں جب کہ علامہ کریم بی کو نام سے نہیں بلکہ ''بی'' یا ''بیگم'' کے نام سے پکارتے تھے۔ میاں بیوی کا رشتہ اتنا حساس ہوتا ہے کہ خفگی یا غصے کی حالت میں بھی بیوی اپنے شوہر سے محبت کی ڈور سے باندھے رکھنے کی اُمید کرتی ہے۔ اسی رشتے کے احساس اور باریکی کو مصنفہ نے ملحوظ نظر رکھا ہے۔

دوسرے منظر میں علامہ کے دوست عبدالسرور کے ہمراہ وکیل سردار بیگم (علامہ کی دوسری بیوی) کا رشتہ لے کر آتا ہے۔ مذکورہ منظر میں علامہ اور عبدل کے درمیان گفتگو ہوتی ہے جس میں علامہ کی طرف سے اس رشتے کے لیے حامی بھر دی جاتی ہے۔ لیکن سردار بیگم کے سالانہ امتحان کی وجہ سے رخصتی روک دی جاتی ہے۔

تیسرے منظر میں علامہ کی زندگی کے ایک ایسے موڑ کو دکھایا گیا ہے، جس میں وہ بے چینی اور تنہائی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اسی منظر میں علامہ کو وہ خط موصول ہوتے ہیں جو جلیل اور اس کے چار ساتھیوں نے سردار بیگم کے دامن کو داغدار کرنے کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ لیکن دوسری طرف علامہ کی ذہنی کشمکش کو بھی دکھایا گیا ہے۔ سردار بیگم چوں کہ معصوم اور بے گناہ تھی لیکن اس کے باوجود بھی

علامہ نے بے نام خط پر بھروسہ کیا۔ خطوط موصول ہونے پر علامہ پر کیا گذرتی ہے اس کا اندازہ چند سطور سے کیا جاسکتا ہے:

''اب برداشت نہیں ہو رہا ہے، میری زندگی ٹھیک ڈھنگ سے چل رہی تھی، میرے حروف، میری نظم، میری شاعری اور میرے اپنے سپنوں کی دُنیا۔۔۔اس رشتے کی وجہ سے پھر میری زندگی میں بھونچال آ گیا، ایک ایسی آندھی آئی جس نے میری پوری زندگی کو بدل دیا ہے۔۔۔لکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن لکھ نہیں پاتا، میری سوچنے کی ساری طاقت سلب ہو چکی ہے، آپ نہیں جانتے میں تنہائی کے اس موڑ پر کھڑا ہوں جہاں سے تا حد نظر بیاباں ہی بیاباں نظر آتا ہے۔'' (ص،۷۹)۔

اقبال جیسے دانشور اور عظیم شاعر بھی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ایک غلط قدم اُٹھاتے ہیں۔ دراصل انسان فکری طور پر کتنا ہی بالغ کیوں نہ ہو اُس میں انسانی فطرت باقی رہتی ہی رہتی ہے اور کبھی نہ کبھی جذبات میں بہہ جاتا ہے اور غلط فیصلہ کر جاتا ہے۔ مصنفہ نے ڈرامائی شکل میں علامہ کے جو جذبات بیان کیے ہیں وہ ستائش کے قابل ہے۔ ایک تنقیدی و تحقیقی مضمون اور تخلیقی تحریر میں یہی فرق ہے کہ تخلیق میں ایک تخلیق کار اپنی خلاقانہ اور فن کارانہ صلاحیتوں کے استعمال سے جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کا بیان بڑے ہی موثر انداز میں کرسکتا ہے، جو کہ صالحہ صدیقی نے مذکورہ ڈرامے میں کر کے دکھایا ہے۔ مذکورہ منظر میں علامہ کا وکیل اور دانش (علامہ کے دوست اور سردار بیگم سے واقف شخص) سے مکالمہ ہوتا ہے۔ جس میں علامہ دانش کو مزید تحقیقات کرنے کو کہتے ہیں اور اسی کے ساتھ تیسرا منظر ختم ہو جاتا ہے۔

چوتھا منظر بالکل مختصر ہے جس میں جلیل اور اُس کے ساتھی، جنھوں نے علامہ کو سردار بیگم کے خلاف خطوط لکھے تھے۔ اس منظر میں جلیل اور اُس کے ساتھیوں کے بیچ مکالمہ بازی ہوتی ہے۔ جس میں وہ اپنی کامیابی پر خوشیاں مناتے ہیں۔ دراصل جلیل خود سردار بیگم سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اور اسی دشمنی کے لیے علامہ کو سردار بیگم کے خلاف بھڑکایا گیا تھا۔

پانچویں منظر میں علامہ کے لیے اُن کے ایک دوست بشیر حیدر کی طرف سے مختار بیگم (علامہ کی تیسری بیوی) کا رشتہ آتا ہے۔ جس کے لیے علامہ راضی ہو جاتے ہیں اور اُن کی شادی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس منظر میں ایک کلائمکس کی صورت میں ایک خط موصول ہوتا ہے جو سردار بیگم نے لکھا ہوتا ہے۔ جس میں وہ اپنی بے گناہی پیش کرتی ہے، لیکن ساتھ میں یہ بھی کہتی ہے کہ وہ علامہ سے قیامت کے روز دامن گیر ہوں گی۔ علامہ رخصتی کراتے ہیں اور اس طرح سے سردار بیگم بھی گھر آجاتی ہے۔ جس سے گھر میں خوشیاں اور رونق لوٹ آتی ہیں۔ یہاں پر علامہ کی زندگی کے اُس حصے کو بہترین انداز میں دکھایا گیا ہے جب علامہ کی زندگی میں خوشیوں کی بہار پھر سے لوٹ کے آتی ہے۔ دوسری طرف کریم بی بھی اپنے سسرال واپس چلی آتی ہے۔ اس طرح علامہ کی خوشیاں دوگنی ہو جاتی ہیں۔ یہاں پر جب علامہ اور کریم بی کے درمیان گفتگو ہو جاتی ہے تو کریم بی کی زبان سے وہ ٹھاٹ بھاٹ بھرے شبد نہیں بلکہ ایک ایسا احساس اُن کی باتوں سے جھلکتا ہے جو اُن کے پچھتاوے کو صاف ظاہر کرتا ہے۔ یہاں پر مصنفہ نے ایک کلائمکس کی مدد سے علامہ کی بے رنگ زندگی میں وہ تمام خوشیاں لوٹائیں جن کو وہ اپنی ازدواجی زندگی میں کھو چکے تھے۔ لیکن اہم اور غور طلب بات یہ ہے کہ مصنفہ نے جس انداز سے مختار بیگم، سردار بیگم اور پھر کریم بی کو علامہ کی زندگی میں واپس لوٹتے ہوئے دکھایا ہے، وہ اُن کی تخلیقی ذہنیت کا پتا دیتا ہے۔ اس طرح فن ڈرامہ نگاری سے مصنفہ کی واقفیت کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات سے شناسا ہیں کہ ڈرامہ کو کس طرح اپنے انجام تک پہنچا دیا جائے اور پڑھنے یا سننے والے کے دل پر گذشتہ مناظر سے جو اُداسی چھائی ہوئی ہے، وہ بھی کیسے دور کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے اُنھوں نے ڈرامہ کو ایک پُر اثر انجام کی طرف لے جانے کو کامیاب سعی کی ہے۔

چھٹے اور ساتویں منظر میں ملکہ برطانیہ وکٹوریہ کے ذریعے بھیجے گئے انگریز کے ہاتھوں ''سر'' کا خطاب دینے کے لیے دعوت نامہ پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس منظر میں علامہ اور انگریز کے بیچ جو گفتگو ہوتی ہے وہ انگریزی زبان میں ہی کی گئی ہے۔ جس سے مصنفہ کی انگریزی زبان سے بھی واقفیت کا علم ہو جاتا

ہے۔ایک طرف علامہ کو"سر" کا خطاب ملنے کی خوشی کو ظاہر کیا گیا ہے۔گھر میں سب خوشیوں سے جھوم اُٹھتے ہیں۔مٹھائیاں اور گہنے وغیرہ خریدنے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔لیکن دوسری طرف اسی منظر میں کریم بی کی حالت خراب ہو جاتی ہے اور اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ سردار بیگم بھی اچانک دل کا دورہ پڑنے سے اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتی ہے۔اس طرح علامہ کی زندگی پر سردار بیگم کے جانے سے جس تنہائی اور درد سے گذرنا پڑا وہ نہایت ہی جذباتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔سردار بیگم کے انتقال سے علامہ کی زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے اور اُن کے جینے کا ڈھنگ بھی تبدیل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ علامہ نے اپنی زندگی خصوصاً ازدواجی زندگی میں کس نوع کے مسائل کا سامنا کیا اور کن کن مراحل سے گذرنا پڑا جس کا اثر اُن کی شاعری پر بھی کہیں نہ کہیں ضرور پڑا ہے۔اسی منظر میں علامہ اپنے دوست عبدالسرور سے اپنے بچوں کی ذمہ داری سونپتے ہیں اور اس جہان فانی سے ایک عظیم شاعر ہم سے جدا ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ کتاب میں"حیات اقبال" کے عنوان سے مصنفہ نے ایک طویل مضمون قلمبند کیا ہے۔جس میں اُنھوں نے علامہ اقبال کے سوانحی کوائف اور شخصیت پر مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔اُنھوں نے اپنے اس طویل مضمون میں علامہ اقبال کی پیدائش سے لے کر اُن کے اس دُنیائے فانی کے رحلت ہو جانے تک کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے۔اس مضمون میں مصنفہ نے بالکل تخلیقی زبان کی تمام لطافتوں اور نزاکتوں کا بھرپور خیال رکھا ہے۔جملوں کی ساخت اور لفظیات قابل تحسین ہے۔اُنھوں نے الفاظوں کے موتی ایسے پیرائے اظہار میں کاغذ پر بکھیر دیئے ہیں گویا کوئی تنقیدی مضمون نہیں بلکہ ایک تخلیق پڑھ رہے ہیں۔تخلیقی زبان کا استعمال کرتے ہوئے مصنفہ نے ایسے الفاظ اور مرکبات کا استعمال کیا ہے جس سے اُن کی زبان دانی کا پتا چلتا ہے۔'زلزلہ افگن'،'برا َفگندہٗ نقاب'،'سخن ناآشنا'،'بحث جاہلاں'،'نظارہٗ تابندہ'،'خواب خرگوش'،'دُرنایاب'،'فلسفۂ ہست و بود'،'دُرشت اندوہ پرور'،'ہجوم بے چہرگاں' ایسے مرکبات ہیں جو اُن کی تخلیقی زبان سے گہری واقفیت کا پتا دیتے ہیں۔مضمون کے شروع کے تقریباً ۴ صفحوں میں مصنفہ نے اقبال کی قدروقامت،اُن کی فلسفیانہ سوچ اور اُن کی فکریاتی ونظریاتی پہلوؤں نیز اقبال کی شاعرانہ عظمت اور فضیلت، اُن کے خوبصورت پیرائے اظہار اور انداز بیان اور اسلوب اور الفاظوں کی بنت اور تراش خراش،استعارات اور تشبیہات کی چستگی اور خیالات کی جدت پر آل احمد سرور،شمیم حنفی،وزیر آغا اور نورالحسن نقوی کے بیانات کی روشنی میں استدلالی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔اس کے بعد علامہ کی سوانحی زندگی کا تفصیلی سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جس میں مصنفہ نے پہلے علامہ کے آباؤاجداد اور اُن کے برہمن ہونے پر مدلل انداز میں بتایا ہے کہ اقبال کو برہمن کہنے میں اعتراض تھا مگر لفظ'برہمن' کو اقبال نے بہ طور علامت تصور کیا ہے۔وہ اس لیے کیوں کہ برہمن ہندو میں ہی ایک قوم پنڈت ہے جو علم آگہی اور علم وفن سے سرفراز تھے،اسی لیے اقبال نے اپنے آپ کو علامتی طور پر پنڈت کہا ہے۔اس کے بعد علامہ کی پیدائش نیز تاریخ پیدائش میں مختلف آراؤں کی روشنی میں صحیح تاریخ پیدائش مدلل انداز میں بیان کی گئی ہے۔اس کے بعد علامہ کی تعلیم و تربیت کے مختلف پڑاؤ جس میں پہلے اُن کے والد صاحب پھر اُن کی والدہ اور پھر اُن کے بڑے بھائی کا اہم رول رہا ہے۔علاوہ ازیں مذکورہ مضمون میں مصنفہ نے علامہ کی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلا تعلیم تک کے سفر کو اپنے دلکش پیرائے اظہار میں بیان کیا ہے۔چوں کہ علامہ اپنی زندگی میں اپنے والدین اور بڑے بھائی کے علاوہ اپنے اساتذہ سے بہت متاثر تھے،جن میں میر حسن،تھامس آرنالڈ نیز جن اساتذہ سے اُنھوں نے فیض حاصل کیا اور متاثر رہے اُن میں نکلسن،میک ٹگارٹ،اے جی براؤن خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔اس کے بعد مصنفہ نے تقریباً مضمون کے نصف حصے کے بعد علامہ کی شاعری پر راشنی ڈالی ہے۔مصنفہ نے شروع کے بیس صفحات میں علامہ کی سوانحی زندگی کی باریکیوں سے واقف کرایا اور دکھایا ہے کہ علامہ کی سوانحی زندگی کی تشکیل میں اُن کے گھریلو ماحول،آباؤاجداد اور تعلیم و تربیت اور اُن کے اساتذہ کا کیا رول رہا ہے۔اس طرح کا سوانحی خاکہ پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ علامہ کی شاعرانہ عظمت سے واقف ہونے کے

ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اُن کی عظمت اور قدر و قامت کی اساس کیا ہے جس نے علامہ جیسے بلند پایہ شاعر کو پیدا کیا۔ مصنفہ نے علامہ کے سفر یورپ سے لے کر ہندوستان واپس لوٹنے تک کے سفر کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ مصنفہ نے علامہ کا حلیہ اور خط و خال اس انداز سے بیان کیا ہے کہ ذہن میں علامہ کی شکل و صورت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جن پہلوؤں پر مصنفہ نے تفصیلی روشنی ڈالی ہے اُس میں علامہ اقبال کی پوشاک، اُن کے عادات واطوار، اُن کی نفاست پسندی، کھانا پینا، مشغولیات، اُن کا انداز گفتگو اور مجلسی آداب ورسوم کی پابندی نیز اُن کے خودداری کے جذبے اور قناعتی مزاج پر بھی مصنفہ نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے اقبال کی سوانحی و شخصی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے پہلو کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ مصنفہ نے علامہ کی توحید و رسالت کے تئیں عقیدے اور حضرت محمد ﷺ کی ذات سے والہانہ محبت وعقیدت کو بھی واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اہل بیت خصوصاً حضرت علی اور حضرت فاطمہ سے جو والہانہ عشق اُن کے دل میں بسا تھا اُس کی گیرائی و گہرائی، عقیدت اور والہانہ محبت اُن کے کلام کی مثالیں دے کر بیان کیا ہے۔ علامہ کی ملازمت سے لے کر اُن کا سیاسی میدان میں قدم رکھنے تک کے سفر کا بھی کافی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد اُن کی تصنیفی و تالیفی کتب کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُنھیں جو انعامات واعزات عطا ہوئے، اُن کا مع تاریخ بیان ہوا ہے۔ آخر میں علامہ کی ۱۹۳۶ء سے لے کر اُن کی دُنیا سے رخصتی یعنی ۱۹۳۸ء تک کی ادبی و علمی مصروفیات کے حوالے سے بھی اہم معلومات پیش کی گئیں ہیں۔

اردو ادب میں مابعد جدید دور میں ڈرامہ نگاری کی طرف بالکل کم توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ادبی اکادمیاں بھی کسی حد تک ذمہ دار ہیں، کیوں کہ جب کوئی ادبی اکادمی کوئی بھی ادبی پروگرام منعقد کراتی ہے تو ڈرامہ میں وہی چچا غالب اور سرسید وغیرہ کے نام سے کام چلا لیتے ہیں۔ جب ہماری ادبی اکادمیاں کچھ نیا سوچ نہیں سکتی ہیں تو سیدھی سی بات ہے کہ ایک اہم صنف سے اردو ادب کو ہاتھ دھو بیٹھنا پڑے گا۔ جب تک ادبی اکادمیاں اپنے فرسودہ لباس کو نہیں اُتاریں گیں تب تک اردو میں نئے ڈراموں کو نہ فروغ ملے گا اور نا ہی نئے ڈرامہ نگاروں کے سامنے آنے کا سوال ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ اردو ادب میں بہت کچھ 'نیا' برآمد ہو رہا ہے۔ پھر ڈرامہ نگاری کو بقیہ اصناف کی طرح فروغ کیوں نہیں مل رہا ہے؟ دراصل ڈرامہ نثر کی ایک مشکل ترین صنف ہے۔ ڈرامہ لکھنا جہاں ایک مشکل ترین آرٹ ہے، وہیں اردو ادیب کے لئے ایک دشوار کُن مرحلہ بھی ہے۔ کیوں کہ ایک ادیب میں عوام میں شامل ہونے کا احساس، عوام کے جذبات کی عکاسی۔ اسٹیج اور روشنی کے تقاضے، کردار سازی و کردار نگاری پر قدرت کاملہ ہونا، مکالموں کی برجستگی اور ان سب سے زیادہ اپنے زمانہ، اپنے عہد کا ترجمان ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈرامہ کی مشکل پسندی اور اس کے تقاضوں کے جھنجھٹ سے دور رہنے کی غرض سے کوئی بھی ادیب ڈرامہ نگاری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہا ہے۔ بلکہ وہ بھی کسی شخصیت یا کسی کتاب پر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کی دھار تیز کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ لیکن صالحہ صدیقی نے ڈرامہ جیسی مشکل صنف کی صورت میں علامہ اقبال جیسے عظیم المرتبت شاعر و دانشور کی زندگی کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کیا۔ یہ وہ کام ہے جو ابھی تک اقبالیات کے بڑے بڑے ماہرین بھی نہیں کر پائے ہیں۔

ڈرامہ ''علامہ'' اقبالیات میں ایک اہم اور قابل قدر اضافہ تصور کیا جائے گا۔ کیوں کہ مذکورہ ڈرامہ اردو ادب کے مابعد جدید دور میں صنف اور موضوع کے اعتبار سے بھی ایک انوکھا اور قابل تحسین کام ہے۔ مابعد جدید دور میں ڈرامہ جیسی صنف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں صالحہ صدیقی کا یہ کام اردو ادب کے ذخیرے میں خصوصاً ڈرامہ نویسی میں اہم اضافہ ہے۔ مذکورہ ڈرامہ میں مصنفہ نے اپنی فنی مہارت اور فنی چابکدستی اور خلاقانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے علامہ اقبال کی زندگی کو ہمارے سامنے ڈرامہ کی صورت میں اس طرح پیش کیا کہ ہر پڑھنے یا سننے والے کے ذہن میں علامہ کی متنوع رنگ کی زندگی صاف دکھائی دے گی۔

عابد حسین گنائی ۔ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کیفی اعظمی: ترقی پسند و دیگر ناقدین کی نظر میں

ہر عہد اور ہر دور میں ایسے لوگ اور شعرا پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے حرکت و عمل سے زندگی کو سنوارنے اور اُسے دوسروں کے لیے ذہنی انبساط کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کی ۔خوشحال زندگی اور اچھے معاشرے کی تشکیل و تکمیل کے خواب دیکھے اور اُس عہد کے دوسرے لوگوں کو بھی دکھائے۔ان میں وہ عظیم شخصیتیں زیادہ احترام کے قابل ہیں۔ جنھوں نے اپنی فنی صلاحیتوں کو معاشرے کی فلاح و بہبودی کے لیے وقف کر دیا۔اردو ادب میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ زیادہ تر شعرا کے یہاں بڑی حد تک اس جذبے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔اگر چہ تحریک سے منسلک زیادہ تر شعرا نے اپنی شاعری کا آغاز رومانی طرز سے کیا۔لیکن باقاعدہ طور تحریک سے جڑنے کے بعد ان سبھی شعرا کے یہاں فکر اور احساس میں نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملی۔اور آگے چل کر ان شعرا نے اردو ادب میں مارکسی خیالات و نظریات کو اہمیت دیتے ہوئے معاشرے کے طبقاتی تضاد اور سماج میں پیدا شدہ استحصال کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ان شعرا نے سیاسی و سماجی بغاوت اور اشتراکی و عوامی انقلاب کو اپنا نصب العین قرار دیا۔انھوں نے اجتماعی فکر اور اجتماعی مسائل کو اپنی شاعری میں مارکسی خیالات و نظریات کے حوالے سے پیش کیا۔اس لیے ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا کے یہاں موضوعات کی یکسانیت کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی یکسانیت بھی پائی جاتی ہیں۔ان ہی شعرا میں کیفی اعظمی کا شمار بھی کیا جاتا ہے یہ ترقی پسند تحریک کے شعرا کے اُس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے زندگی کے ہر دور میں محنت کش عوام، مظلوموں کی حمایت اور ان کی تحریکوں سے جڑے رہے جو انصاف اور آزادی کے لیے محکوم اور مظلوم انسانوں کی جدوجہد، ان کے عزائم، ان کی قوت اور ان کی آخری فتح پر اپنا ایمان اور عقیدہ رکھتے ہیں۔کیفی اعظمی کی ابتدائی شاعری کے مخاطب بھی یہی کسان اور محنت کش عوام کا طبقہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ترقی پسند تحریک سے وابستہ جن ناقدین نے کیفی اعظمی کی شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ان میں خاص کر احتشام حسین، محمد حسن، سجاد ظہیر، محمد علی صدیقی، قمر رئیس اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا نام قابل ذکر ہیں۔ترقی پسند تنقید کے اصول و نظریات کے دائرے سے باہر جن ناقدین نے کیفی اعظمی کی شخصیت اور شاعری پر تنقیدی مضامین قلمبند کیے ہیں ان میں گوپی چند نارنگ، مظفر حنفی، شافع قدوائی، انور سدید، جگن ناتھ آزاد اور سحر انصاری کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہیں۔کیفی اعظمی ترقی پسند شعرا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں وہ سبھی خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہے جو ترقی پسند شعری اسلوب کی عام خصوصیات میں شمار کی جاتی تھی اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں وہ منفرد خصوصیات بھی موجود پائے جاتے ہیں جو ان کے انفرادیت کی نشاندہی کرتی ہے۔کیفی اعظمی کی ترقی پسند شاعری اور اسلوب کے حوالے سے تحریک کے بانی سجاد ظہیر ان کے پہلے شعری مجموعے کے پیش لفظ میں یوں رقم کرتے ہیں۔بقول سجاد ظہیر:

> ''جدید اردو شاعری کے باغ میں ایک نیا پھول کھلا ہے ایک سرخ پھول ۔۔۔کیفی کی شاعری قدیم و جدید دونوں قسم کی ادبی غلاظتوں سے پاک ہے۔اس میں ترقی پسندی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔اس کے خیال میں نصب العین صاف و

متعین' اس کا طرز بیان سیدھا اور براہ راست' اس کی تشبیہیں و استعارے نئے اور دلکش ہیں ۔وہ اشتراکیت کا پر جوش حامی ہے ۔اس نے اپنی زندگی محنت کشوں کی خدمت اور ان کی جد وجہد میں شرکت کے لیے وقف کردی ہے جدید دور کے ترقی پسند شاعر اسی قسم کے ہوں گے'' [1]

ترقی پسند تنقید کے ذیل میں ایک اہم اور معتبر نام احتشام حسین کا ہے ۔جنھوں نے تنقید پر مبنی بہت ساری تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں ۔احتشام حسین کی تنقیدی تحریریں خاص کر ترقی پسند تنقید کے اصول ونظریات کے ضمن میں اہم متصور کی جاتی ہے ۔کیفی اعظمی کے متعلق وہ اپنے ایک تنقیدی مضمون میں یوں رقم طراز ہیں۔لکھتے ہیں۔

''کیفی اعظمی ایک مقبول ترقی پسند اور انقلابی شاعر ہیں ۔۔۔انھوں نے اپنی ابتدائی عمر میں رومانیت میں ڈوبی ہوئی نظمیں لکھیں ۔پھر شعوری طور پر قوم پرستی اور آزادی کے گیت گانے لگے ۔انھوں نے ملک اور غیر ملک میں ہونے والے سیاسی واقعات پر بھی دلچسپ اور پر اثر نظمیں لکھی ہیں ۔عوام کے سکھ دکھ کو انھوں نے اپنی نظموں میں اس طرح سمو دیا ہے کہ فن اور موضوع ایک ہو جاتے ہیں'' [2]

کیفی اعظمی نے شعر وادب کے ذریعے سے نہ صرف ماضی کے انسانوں کے تجربات و جذبات کو نئے طرز اسلوب اور تشبیہات واستعارات میں پیش کرنے کی کوشش کی ۔بلکہ ان کے یہاں اپنے عہد کے پر آشوب حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ اُس ماحول اور ذاتی واجتماعی تجربات کا ثمرہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے جس کے اندر رہ کر ایک شاعر وادیب ایک حساس' دردمند دل اور ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت سے زندگی گزارتا ہے ۔اس دور کے سارے نشیب و فراز اور مدو جزر اُس دور کے شعرا کے تحریروں میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں ۔کیفی اعظمی نے بھی فیض احمد فیض جیسے بڑے شاعر کی طرح اپنے شعر وادب کا آغاز رومان کی حسین ورنگین وادیوں سے شروع کیا تھا اور پھر آگے چل کر رومان سے انقلاب کی طرف دکھائی دیتے ہیں ۔اردو ادب کے ماہر اقبالیات پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضمون بعنوان ''کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر'' میں کیفی اعظمی کے شاعری کے تعلق سے یوں رقمطراز ہیں وہ لکھتے ہیں۔

''جب ہم کیفی اعظمی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں اپنے گردو پیش کے ماحول پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کی آواز بھی نظر آتے ہیں ۔ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے ۔ان کی ابتدائی شاعری میں رومانیت اور کلاسیکیت کا امتزاج ایک خوبصورت اکائی کی صورت میں نظر آتا ہے ۔ان کی شاعری کسی ایک فارمولے کی پابند نہیں ہے اس کی نگاہ ماضی پر بھی ہے حال پر بھی اور مستقبل پر بھی ۔غم جاناں بھی اس کا موضوع ہے غم ذات اور غم دوراں بھی' اس کی شاعری انسان کے امکانات سے لبریز ہے اور انسان کی ان مجبوریوں کے ذکر سے بھی جو خود انسان نے انسان کے لیے پیدا کی ہیں'' [3]

کیفی اعظمی انسان دوستی کا اعلیٰ درجہ رکھتے تھے ۔دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کے لیے ان کے دل میں ہمدردی کا جذبہ نمایاں ہے ۔ان کے یہاں انسان دوستی مذہب وملت' اونچ نیچ' کالے گورے اور امیر غریب کے تصور کی قیود سے آزاد دکھائی دیتا ہے ۔وہ جب بھی کسی ملک کی حمایت میں کچھ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے اس ملک کے غریب عوام' اور مظلوم لوگوں کی طرف اپنی توجہ مبذول کراتے ہیں ۔کیفی اعظمی خاص کر زندگی کے ہر دور

میں محنت کش عوام سے جڑے رہے۔کیفی اعظمی جدو جہد کرنے والے مزدوروں اور محنت کش عوام کے جذباتی آہنگ سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ان کے یہاں تحریروں میں کوئی پیچیدہ یا مشکل اور چونکا دینے والے تجربات نہیں ہیں۔اس لیے انھوں نے ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جو اس مظلوم اور غریب طبقے سے تعلق اور مطابقت رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کیفی اعظمی کے اسلوب میں نہایت ہی آسان اور عام فہم انداز بیاں پایا جاتا ہے ان کی تحریریں فنی پیچیدگیوں سے مبرا اور آزاد دکھائی دیتا ہے ترقی پسند تنقید سے منسلک نقاد پروفیسر قمر رئیس اس ضمن میں یوں تحریر کرتے ہیں۔

''کیفی کی بیشتر نظموں کے مخاطب یہی محنت کش عوام ہیں۔ان نظموں میں سیدھا سادہ طرز اظہار اور جوشیلا رزمیہ لب و لہجہ ہے۔وہ جد وجہد کرنے والے مزدوروں اور کام گاروں کے جذباتی آہنگ سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ان نظموں میں کوئی پیچیدہ امیجری یا چونکا دینے والے تجربات نہیں ہیں۔لیکن ان میں سماجی اور سیاسی تناؤ کی جو فضا ہے وہ اس عہد کی بنیادی آویزش اور تضادات کی ترجمانی ضرور کرتی ہے''۔ ۴

کیفی اعظمی نے اپنے شعری تحریروں میں پیکروں کا استعمال بھی بڑے ہی نہایت اور ماہرانہ انداز میں کیا ہے۔ان کے یہاں جو پیکر شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ سننے والے قاری اور سامعین کو سیدھے طور پر متاثر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں استعمال کی جانے والی پیکروں میں بصری اور سمعی دونوں عناصر کی موجودگی بیک وقت دکھائی دیتی ہے جس کی وجہ سے کیفی اعظمی کی شاعری میں زیادہ دلکشی پیدا ہوتی ہے۔کیفی اعظمی کے اس شعری محاسن سے متعلق شافع قدوائی یوں بیاں کرتے ہیں۔

''ان کی شاعری میں بصری پیکر تواتر کے ساتھ' فنکارانہ شعور کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں' ایسا لگتا ہے کہ ہر تجربہ شاعر کے حواس پر آنکھ کے حوالے سے وارد ہوتا ہے'' ۵

کیفی اعظمی کے یہاں ایک حساس اور دردمند دل تھا انسانیت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔وہ انسانیت کے درد کو سمجھتے اور محسوس کرتے تھے۔عام انسانوں' غریبوں' کسانوں' محنت کشوں' اور مزدور طبقے کی زندگی اور اُس کے مسائل' ملک وقوم میں پھیلی ہوئی ابتری اور دیگر اقسام جیسے فرقہ واریت' ذات پات' بھید بھاؤ' سماجی ظلم اور ناانصافی اور نابرابری اور عدم مساوات وغیرہ جیسے حالات سے ان کا دل بہت زیادہ رنجیدہ رہتا تھا۔ان تمام موضوعات کو کیفی نے اپنی تحریروں میں برتنے کی کوشش کی اور ہمیشہ ان کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔اور ہمیشہ اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو محنت ومشقت' میل ملاپ' بھائی چارگی' اتحاد واتفاق' اور امن وآشتی اور سلامتی کا پیغام دیتے رہے۔محمد حسن نے کیفی کی شاعری کو تین مختلف ادوار میں منقسم کیا ہے۔ان تینوں ادوار کے تعلق سے محمد حسن کیفی کی شاعری کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔

''کیفی اعظمی کی شاعری تین مختلف ادوار سے گزری ہیں اور ان ادوار کی پہچان آسان ہے پہلے دور میں کیفی کی شاعری خارجی واقعات کے درمیاں ٹکراؤ سے عبارت ہے' دوسرے دور میں خارج اور ذات کی باہمی آویزش سے اور اس آویزش میں محض بیان نہیں تجربہ اور کیفیت سے اصل شعر بنتے ہیں۔اس دور میں کیفی کی شاعری کا لہجہ وامیجری اور لفظیات سبھی بدلے ہوئے ہیں خود اپنی لفظیات اور امیجری ڈھالنے کی کوشش کی۔تیسرے دور کی شاعری میں زندگی کے اُس جذباتی رویے کو اولیت ملی ہے جو مختلف رنگوں میں مختلف مسائل کے دوران ابھرتا ہے۔اس دور کی

شاعری میں جو آگاہی ملتی ہے اس کے بارے میں
دو باتیں آفاقیت اور تاریخیت اہم ہے'' ۶

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو ادب کے دور حاضر میں ایک معتبر نام ہے۔ ان کا شمار اردو ادب کے مابعد جدیدیت تنقید کے بانیوں میں لیا جاتا ہے۔ انھوں نے تنقید اور دوسرے موضوعات پر بہت ساری کتابیں تحریر کی ہے جو ان کے نام کو اردو ادب میں ہمیشہ تابندہ رکھیں گے۔ انھوں نے کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک مفصل مضمون بعنوان ''جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ کیفی کی شاعری کے حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں۔

''ان کی شاعری میں اسپریشن کے بنیادی نکتے تین ہیں۔ اول فرقہ واریت' ذات پات' سماجی اونچ نیچ' اور بھید بھاؤ کے خلاف شدید احتجاج کہ جب تک اس فرقہ واریت کو کچلا نہیں جاتا ہندوستان ایک بہتر مستقبل کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ دوسرا سماجی ظلم اور بے انصافی کے خلاف آواز اٹھانا' محنت کشوں' غریبوں اور بے سہارا طبقے کے حقوق کے لیے آواز اٹھانا' تیسرا یہ کہ امید' عزم' حوصلے اور ولولے سے ہاتھ نہ اٹھانا کہ شاعر اور فنکار کا کام خواب دیکھنا ہے'' ۷

اسی طرح انور سدید اپنے مضمون میں کیفی کی شاعری سے متعلق یوں بیاں کرتے ہیں۔

''کیفی اعظمی نے اپنی شاعری میں گردوپیش کے انسان کو اہمیت دی ہے' انھوں نے حوادث و حالات کو موضوع بنایا ہے اور اس طرح ہمارے سامنے وہ شاعر ابھرتا ہے جو خواص پسند نہیں اور جسے گفتگو عوام سے ہے۔ اب وہ شاعری کے اونچے سنگھاسن سے اتر کر زمین پر ننگے پاؤں چل رہے ہیں۔ سنگ ریزوں اور کانٹوں نے ان کے پاؤں کو زخمی کر دیا ہے لیکن ان کے گرد عام لوگوں کا ہجوم ہے اور وہ اپنی ذات کو سرفراز کرنے کے بجائے اپنی آواز کو ہجوم کی آواز کے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہے تھے'' ۸

سحر انصاری نے بھی کیفی کی شاعری سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''ان کی شاعری اور شخصیت میرے خیال میں تین اجزا کا خوبصورت مرکب ہے حوصلہ' دردمندی اور خلوص۔ شخصیت کے یہی اجزا انھیں بھرپور رومانیت کی طرف بھی لے گئے۔ مزدوروں' کسانوں اور ایک نظریاتی انقلاب کا نقیب بننے پر مائل کرتے رہے انہی کے زیر اثر وہ پوری انسانیت کے حال اور مستقبل کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ اور یہی اجزا ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک نیم معذوری کی زندگی اس طرح بھرپور طریقے سے بسر کر رہے ہیں جب کہ وہ اپنی مکمل تندرستی کے زمانوں میں گزار رہے تھے'' ۹

محمد علی صدیقی نے بھی کیفی اعظمی کی شاعری پر ایک مضمون ''کیفی اعظمی ۔۔ شاعری اور آدرش'' کے نام سے تحریر کیا ہے جس میں وہ ان کی شاعری کے بارے میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

''کیفی اعظمی' اقبال اور جوش سے متاثر ہیں۔ وہ بہت واضح طور پر اپنے نظریہ کے ساتھ از اول تا ایں دم ثابت قدم ہیں۔ اور یہی وہ خوبی ہے جو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز و متمیز کرتی ہے جنھوں نے کبھی شاعری کو نظریہ پر اور نظریہ کو شاعری پر قربان کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ کیفی اعظمی ترقی پسند شاعری میں مواد اور ہیت کے

خوبصورت ملاپ کا دوسرا نام ہے'' [10]

الغرض کیفی اعظمی کی نظر ابتدا سے ہی مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور مظلوم طبقے پر رہی ہے۔ ان ہی حالات میں رہ کر انھوں نے جو خیالات و تجربات حاصل کیے وہی بعد میں ان کی شاعری کا موضوع بنے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیفی اعظمی شروع ہی سے مزدوروں کی مصیبتوں، درمیانی طبقے کی چھوٹی بڑی ناکامیوں، عورت کی بے بسی اور مظلومیت، انسان کی تذلیل، چھوٹے بڑے کی تفریق، سماجی و معاشی دشواریوں اور ان سے پیدا شدہ ناآسودگی و سیاسی بدامنی وغیرہ جیسے موضوعات کو کیفی نے اپنی شاعری کا مرکز و محور بنایا ہے تو اس طرح کیفی نے اپنے فن کا رشتہ براہ راست عوام سے برقرار رکھا جو صحیح معنوں میں ایک سچے فنکار کا فرض اول متصور کیا جاتا ہے۔ کیفی نے اپنی شاعری کو عوام کے لیے مختص کیا اور انسانی اقدار کی حمایت میں اپنا وقت صرف کیا۔ مساواتی کیفیات و اقدار بھی کیفی کی شاعری کے اہم محور متصور کیے جاتے ہیں کیفی نے ہرگز دل بہلاؤ اور وقت گزاری کے لیے شاعری نہیں کی بلکہ جوش و جذبہ اور حرکت و حرارت کے عناصر سے ذہن و قلب کو بیدار کرنے والی شاعری ہمیشہ کی۔ اور آخر پر پروفیسر مظفر حنفی کی اس رائے کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے کیفی کی شخصیت اور شاعری سے متعلق کہی ہیں۔

''میں جب بھی کیفی اعظمی کے کلام کا موازنہ ان کے دوسرے معاصرین سے کرتا ہوں تو ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ وہ اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کی اہم ترین آوازوں میں سے فیضؔ اور مخدوم محی الدین کے بعد تیسری بڑی آواز ہیں'' [11]

حوالہ جات:

۱ سجاد ظہیر، پیش لفظ، جھنکار، ص ۴۶۲
۲ احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص ۲۸۴
۳ خورشید علی خان، کیفی اعظمی، شخصیت اور فن کے آئینے میں، ص ۲۱۷
۴ قمر رئیس، کیفی اعظمی کی تخلیقی فکر کا سفر، ص ۱۲۸
۵ ایوان اردو، ماہنامہ دہلی، اکتوبر ۱۹۹۸، ص ۱۵
۶ شاہد ماہلی، کیفی اعظمی عکس اور جہتیں، ص ۱۱۷
۷ ایوان اردو ماہنامہ دہلی، ۱۹۹۸، ص ۱۶
۸ انور سدید، کیفی اعظمی، معاملات جہاں کا شاعر، ص ۱۵۹
۹ خورشید علی خاں، کیفی اعظمی شخصیت اور فن کے آئینہ میں، ص ۲۳۳
۱۰ خورشید علی خاں، کیفی اعظمی شخصیت و فن کے آئینہ میں، ص ۱۴۷
۱۱ مظفر حنفی، جہات و جستجو، ص ۱۲۰

خوشنما ۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

غزل

اب چاروں طرف غم کا تپتا ہوا صحرا ہے
اس غم بھرے صحرا میں ہر سمت اندھیرا ہے

وہ شوخیاں وہ خوشیاں کس سمت گئی آخر
چہرے پہ اداسی اور آنکھوں میں اندھیرا ہے

سب چھوڑ کے جانا ہے، اعمال ہی جانے ہیں
دنیا میں ہمارا کچھ اور کچھ نہ تمہارا ہے

مت کاٹنا اے مالی اس شاخ کو ہرگز تم
جس شاخ پہ برسوں سے بلبل کا بسیرا ہے

جو غم تھے ملے ہم کو وہ بھلا تو دئے لیکن
اک درد ہے معمولی اک زخم بھی گہرا ہے

اب دیکھ شبِ غم سے باہر بھی خوشیؔ آجا
ہر سمت اجالا ہے ہر سمت سویرا ہے

شگفتہ۔ بی ایس سی سال اول۔ گورنمنٹ ڈگری کالج سدی پیٹ، تلنگانہ

قومی یکجہتی کے علمبردار، نظیر اکبرآبادی

ملک میں بھائی چارگی اور اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے جہاں بہت سے طریقے عمل میں لائے گئے ہیں وہیں اردو شعراء نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ ایک اہم رول ادا کیا ہے اس سلسلے میں نظیر اکبرآبادی کا نام ناقابل فراموش ہے۔

نظیر اکبرآبادی اردو کے ایسے شاعر ہیں جن کو ہندوستان کا جمہوری اور عوامی شاعر کہنا مبالغہ نہیں ہوگا۔ انہوں نے اپنے وطن سے والہانہ محبت کی۔ یہاں کے رسم ورواج، مذہبی عقائد، تقریبات، یہاں کے رُت وموسم، پہاڑ دریا، میلے ٹھیلے غرض کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اسی کی بدولت انہوں نے عوام وخواص کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ معاشرت، سماج او رماحول کی سچی عکاسی اور ترجمانی کرکے سب کے دلوں میں انسانیت کے احترام کا جذبہ پیدا کیا اور اخوت ومحبت کی فضا پیدا کی۔ نظیر کی بیشتر نظمیں رواداری اور بے تعصبی کی اعلیٰ مثال ہیں۔ نظیر اکبرآبادی رنگ ونسل، قوم وقبیلے اور مذہب وملت کے اختلافات کو مہمل سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں یہ تمام چیزیں پیدائشی اتفاق ہیں۔ اصل میں جو چیز قابل احترام ہے وہ انسانی ہمدردی اور رواداری ہے۔ یہ چیز اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب انسان مذہب وملت، کالے گورے، ادنی اعلیٰ، اور امیر وغریب کے امتیازات کو بھول کر صرف اور صرف انسانیت کے مضبوط رشتے سے اپنی ذات کو وابستہ کرلے۔ یہی وہ اصول ہے جو اختلافات کی دیوار کو ڈھا کر عوام کے درمیان محبت واخوت اور اتحاد ویگانگت کی فضا قائم کر سکتا ہے۔

نظیر نے دوسرے مذاہب کے پیشواؤں اور تیوہاروں سے متعلق جو نظمیں لکھیں ہیں ان سے نہ صرف نظیر کی رواداری ظاہر ہوتی ہے بلکہ واضح طور پر اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ نظیر ان تیوہاروں، تقریبوں اور میلوٹھیلوں میں پوری دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ آج بھی نظیر کی ان نظموں کے ذریعہ میل ومحبت اور اتحاد کا درس دیا جاسکتا ہے۔ بھیرو جی کی تعریف میں نظیر نے جو نظم کہی ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

کیا کیا مچی ہیں تیرے دربار کی بہاریں
بھگتی کلا پہ تیری جی جان اپنا واریں
سب اپنا اپنا کارج من مانتا سنواریں
سیوک چرن کو چومیں اشٹی کھڑے پکاریں
تیری سرن گہی ہے کر تو نہال بھیروں
اے پرت پال دیوت مدھ مست کال بھیروں

نظیر اکبرآبادی کی تقریباً تمام شاعری گنگا جمنا تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں متعدد جگہ کرشن جی کی بانسری کا ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے سری کرشن جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظمیں لکھ کر ان سے مسلم طبقے کی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ نظیر نے تیوہاروں میں سب سے زیادہ نظمیں ہولی پر اور دیوی دیوتاؤں میں سب سے کثیر تعداد میں نظمیں کرشن جی پر لکھی ہیں۔ ان کی اس قبیل کی نظمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مددگار ثابت

ہوسکتی ہیں۔ان نظموں میں احترام اور عقیدت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ان نظموں کو پڑھ کر کرشن جی کی پیدائش معلوم ہوتی نظم ''جنم کنہیا جی'' سے ایک بند ملاحظہ ہو ؎

ہے ریت جنم کی یوں ہوگی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دوبالا ہوتا ہے
سب بات بٹھا کے بھولے ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند مندیلے باجت ہیں جب بھون اجالا ہوتا ہے
یوں نیک پچھتر لیتے ہیں اس دنیا میں سنسار جنم
پر ان کے اور ہی لچھن ہیں' جب لیتے ہیں اوتار جنم

نظیر نے نہ صرف ہندو دیوی دیوتاؤں پر نظمیں لکھیں بلکہ سکھوں کے پیشوا گرونانک کی شان میں بھی نظم لکھی ہے۔ایک بند ملاحظہ فرمائیں ؎

کہتے ہیں نانک شان جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
مقصود مراد، امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف وکرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا، ارداس کرو اور ہردم یو لو واہ گرو

نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں مذہبی رواداری اور انسانی محبت کو نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے وہ بلاتفریق مذہب وملت اور رنگ ونسل ہر انسان سے محبت کرتے ہیں۔نظیر دنیا کی فنا اور اہل دنیا کی چندروزہ حیات کا مقتضی نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ باہمی تفرقہ اور تنازع محض بیکار اور عبث ہیں، اس لیے بے تعصب، پرامن اور صلح کل زندگی بسر کرنے کی تلقین اس طرح کرتے ہیں ؎

جھگڑا نہ کرے مذہب وملت کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آن
زنار گلے یا کہ بغل بیچ ہو قرآن
عشق تو قلندر ہے، نہ ہندو نہ مسلمان
کافر نہ کوئی صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

اس بند کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیر اکبرآبادی ہندوستان کے موجودہ سیاسی تلاطم کو اپنے دوربیں نگاہوں سے دیکھ چکے تھے۔جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اسے کسی مذہب سے بیر نہیں ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ہندو اور مسلم دونوں کے تیوہار سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ان کے کلیات میں جہاں عید اور شب برات پر نظمیں ملتی ہے وہیں ہولی' دیوالی اور بسنت جیسے ملکی تیوہاروں کی چہل پہل کو بھی اس خوبی سے نظم کیا ہے، جس سے ان کی دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری ظاہر ہوتی ہے۔نظیر نے نہ صرف ہندوؤں کے تیوہاروں پر قلم اٹھایا ہے بلکہ ان کے معتقدات کی تصویر کھینچ کر اپنی وسیع النظری کا ثبوت بھی دیا ہے۔نظیر کی اس وسیع النظری اور رواداری پر سجاد باقر رضوی نے ایک جملے میں بڑی عمدہ بات کہی ہے۔یہ جملہ نظیر کے مسلک پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔آپ فرماتے ہیں۔

''نظیر نظر کے شاعر تھے، نظریات میں نہ آسکے''

کوئی خالق باری' مولا' رحمٰن' رحیم' اللہ' تنگوری
کوئی لاکھ روپ کرتار کہے' نرکال نرنجن؟ نردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرلے' کوئی بولے شیوشیو ہری ہری
کوئی دانو نیت' یوائل' کوئی راچھس' دیوت' جن پری

اس حمد میں نظیر اکبرآبادی نے خدا کے لیے ان تمام ناموں کا استعمال کیا ہے جو مختلف مذاہب، عقیدوں اور فرقوں میں اپنے معبود کو یاد کرنے کے لیے مستعمل ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے کثرت سے ایسی نظمیں لکھی ہے جو آج قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں معاون ثابت ہورہی ہے۔

نشورؔ واحدی

یومِ جمہوریت

ہند کی تازہ روایت کا ہے نام اے ساقی
آج ٹکراتے نہیں جام سے جام اے ساقی

شیشے خالی تھے تو تاریک تھی گلشن کی فضا
تو نے دیکھی ہے غریبوں کی وہ شام اے ساقی

مئے تو ہے ایک مگر ہوتی ہے تقسیم کے بعد
ساغرِ شیخ و برہمن میں حرام اے ساقی

نکتہ چینی کے سوا پہلے کوئی کام نہ تھا
ہوش میں آئے ہیں اَب جا کے عوام اے ساقی

منتظر جس کی تھی عرصہ سے صَداقت کی نظر
آ رہا ہے وہی پائندہ نظام اے ساقی

اور ہوں گے جنہیں صہبا کا تقاضا ہوگا
ہم کو خَالی ہی پیالے سے ہے کام اے ساقی

طَرز رفتار نئے دور نے سیکھی پھر سے
زندگی پھر سے ہوئی محوِ خرام اے ساقی

ظہورؔ ظہیرآبادی۔ حیدرآباد تلنگانہ

غزل

بہت سہتے رہے اب تک نہ اب کچھ بھی سہیں گے ہم
جو ہے دستور میں اپنا وہ حق لے کر رہیں گے ہم

یہ جتنا ہے تمہارا ملک اتنا ہی ہمارا ہے
نکالے گا کوئی کیسے یہیں پر رہی رہیں گے ہم

وہ نفرت کی سیاست کرتے ہیں کرنے بھی دو ان کو
محبت ملک سے کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے ہم

نہ چھوڑیں گے وطن مٹ جائیں گے مر جائیں گے آخر
کہ جامِ شہادت پی کے بھی زندہ رہیں گے ہم

سبق ہم نے پڑھا ہے بس صداقت اور شجاعت کا
اگر ہوں دار پر بھی تو سدا سچ ہی کہیں گے ہم

زمانہ بن گیا دشمن ہمارے دین و ایماں کا
کہ اب تو جاگ جاؤ کب تلک سوتے رہیں گے ہم

ظہورؔ اپنے وطن میں ہم ہی دہشت گرد کہلائیں
یہ الزامات جھوٹے کب تلک سہتے رہیں گے ہم

''ایک شام پروفیسر مظفر شہ میری کے نام'' کا کامیاب انعقاد

شاگردوں اور ہم عصر دانشوروں کا خراج تحسین۔ ۷ر تصانیف کی رسم اجراء

''ایک شام مظفر شہ میری کے نام'' کے موقع پر کتابوں کی رسم اجراء۔ تصویر میں دائیں سے: ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی، حضرت رحمٰن جامی، نثار شاہ، جناب مظفر شہ میری، ڈاکٹر شفیع اخلاص، ڈاکٹر آمنہ آفرین، جناب رحیم الدین انصاری، ڈاکٹر شیخ نعمان، پروفیسر رحمت یوسف زئی، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین اور ڈاکٹر سید شاہ عبدالمہیمن قادری دیکھے جاسکتے ہیں۔

رپورٹ: قاسم مصطفیٰ

''ایک شام پروفیسر مظفر شہ میری کے نام'' تقریب کا بروز شنبہ ۱۴ر دسمبر کو شام ۷ر بجے میڈیا پلس آڈیٹوریم میں انعقاد عمل میں آیا۔ حلقہ شاگردان مظفر شہ میری نے اس تقریب کا اہتمام کیا تھا، جس میں سات تصانیف کا رسم اجراء عمل میں لایا گیا۔ ان میں سے چار پروفیسر شہ میری کی ہیں اور تین ان کے شاگردوں کی تصانیف ہیں۔ صدر نشین تلنگانہ اردو اکیڈمی رحیم الدین انصاری نے اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر شہ میری سے اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نیوز 18 اردو کے پروگرام ''آؤ اردو سیکھیں'' کے لیے پروفیسر شہ میری کے انتخاب کو ایک جوہری کی جانب سے ہیرے کی پہچان سے تعبیر کیا۔ شاگردان کی جانب سے محفل کے انعقاد کو لائق تحسین قرار دیتے ہوئے منکسر المزاجی سے سب کو متاثر کرنے والی عظیم شخصیت قرار دیا۔ صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکیڈمی ڈاکٹر ایس ایم نعمان نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ زبان وادب کا تعلق ماحول سے ہوتا اور حیدرآباد میں اردو ادب کے فروغ کے لیے سازگار ماحول ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ شعرائے کرام وادیبوں نے اپنی تحریروں سے انقلاب لایا اور ظلم کے خلاف خاموش انداز میں اپنی تحریروں کے ذریعہ طوفانی انقلاب لایا ہے۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ایک استاد جب محبت کی فصل بوتا ہے تو محبت کی فصل کاٹتا بھی ہے اور ایک انسان کو آزمانے سفر کی تلقین کی گئی ہے اور پروفیسر شہ میری انہیں ہمشیرہ کا درجہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ وائس چانسلر کے عہدہ پر ان کا انتخاب ان کی جہد مسلسل کا نتیجہ ہے اور مشکل وقت میں ثابت قدمی وصبر سے انہوں نے زندگی کے ہر لمحہ کو جاویداں بنایا۔

پروفیسر رحمت یوسف زئی نے پروفیسر شہ میری کو ایک بلند پایہ شخصیت اور قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر شہ میری حیدرآباد کے ادبی ماحول سے بہتر واقف ہیں۔ انہوں نے استعارے کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی تصانیف کو عرق ریزی سے لکھی جانے والی تحریر قرار دیا۔ ڈاکٹر سید شاہ عبدالمہیمن قادری نے کہا کہ حضرت شہ میر اولیاء بخارا سے کڑپہ تشریف لائے اور بخارا جیسے سرسبز وشاداب علاقہ کو چھوڑ کر کڑپہ جیسے گرم ترین مقام کو اپنا مسکن بنایا اور اشاعت دین کے لیے عظیم قربانی دی۔

پروفیسر شہ میری کے رفیق نثار احمد نے پروفیسر شہ میری کے تدریسی خدمات کو سرمایہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی کاوشوں سے لوگ آگے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ ڈاکٹر آمنہ آفرین نے کہا کہ ایک استاد کے لیے بہترین انسان ہونا لازم ہے جو پروفیسر شہ میری ہیں۔ ان کی نگرانی میں ۲۱ رطلباء نے پی ایچ ڈی اور ۴۳ رطلباء نے ایم فل کی تکمیل کی۔ رجسٹرار ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی وینکٹ رمنا چاری نے بانی وائس چانسلر کے لیے حکومت کی جانب سے پروفیسر مظفر شہ میری کے انتخاب کو ایک بہترین فیصلہ قرار دیتے ہوئے ان کو ایک سادہ مزاج عظیم شخصیت قرار دیا۔

اس موقع پر پروفیسر مظفر شہ میری کی چار کتابیں ''اردو غزل کا استعاراتی نظام، حضرت عبدالحق شہ میری ثالث: حیات شخصیت اور فن تامل سے ترجمہ دو شعری مجموعہ ''کہکشاں اور مجذوب'' اور اس کے علاوہ پروفیسر مظفر شہ میری کی شاگرد ڈاکٹر آمنہ آفرین، ڈاکٹر شفیق اخلاص اور رضیہ دانش اور ڈاکٹر غوثیہ بانو کی کتابیں ہمارے آپ کے مظفر شہ میری، حیدرآبادی اردو کا سماجی ولسانی مطالعہ اور عہد عثمانی کے فرامین ودستاویزات کا لسانی واسلوبیاتی مطالعہ کی رسم اجراء عمل میں لائی گئیں۔ حضرت رحمٰن جامی نے منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ تقریب کا آغاز قرات کلام پاک سے ہوا۔ ڈاکٹر فاضل حسین پرویز نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے تقریب کے انعقاد کو احترام وخلوص کا امتزاج قرار دیا۔ تقریب کی کاروائی مولانا ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر صدائے شبلی حیدرآباد نے چلائی اور پہلے مرحلے میں شاگردان کو خطاب کے لیے مدعو کیا۔ ڈاکٹر محمد انوارالدین، ڈاکٹر آمنہ آفرین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر امین اللہ، ڈاکٹر سمیہ تمکین، دختر شہ میری ثمینہ نوشین اور فرزند شہ میری معراج احمد نے بھی خطاب کیا۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:

JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل ''المرأۃ الصالحۃ'' ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

’’ساحلوں کے شہر میں‘‘
ایک مختصر مگر فکر انگیز سفر نامہ

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا،اس لئے مصنفین،مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔(ادارہ)

تعارف وتبصرہ: **وصیل خان**

نام کتاب : ساحلوں کے شہر میں

مصنف : ڈاکٹرمحمد الیاس الاعظمی

قیمت : 100/-روپۓ۔صفحات: 60

ملنے کے پتے: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۱۰۰۱۷ ۲۷ ث مکتبہ جامعہ،اردوبازار جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

اردو میں سفرناموں کی روایت کافی قدیم ہیاگران کا شمار کیا جائے تو کتابوں کی ایک اچھی خاصی طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے۔لیکن کچھ ہی سفرناموں کو یہ اختصاص حاصل ہے جو علمی،فنی اور معلوماتی سطح پر مکمل معیار تک پہنچے ہوں۔ورنہ عام طور پر بیشتر سفرنامے محض سفر نامے ہی تک محدود ہوکر رہ گئے جنہیں عوامی دربار میں کوئی خاص پذیرائی یا مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی۔سفرنامے کی اولین شرط یہ ہے کہ راوی خودستائی میں مبتلا نہ ہواس کے برعکس وہ اپنیمشاہدات وتجزیات کے ذریعے قاری کونت نئی معلومات واکتشافات سے آشنا کرے جواسے علم و ادراک کی ایک نئی دنیا کی سیر کرادے جس کی روشنی میں وہ اپنے زندگی کے سفر کوآسان بناسکے۔’’ساحلوں کے شہر میں‘‘ ایک ایسا ہی سفرنامہ ہے جو حد درجہ اختصار کے باوجود انتہائی پراز معلومات ہےجس کے مصنف ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ہیں جنھوں نے زبان و بیان کی لطافت کے ساتھ ساتھ تجزیاتی وتبصراتی انداز اختیار کرتے ہوئے سفرنامے کوازحد دلچسپ ودلپذیر بنادیا ہے۔انجمن اسلام جیسے اعلیٰ ترین علمی ادارکے تعلق سے جہاں انہوں نے تعریفی وتوصیفی کلمات کہتے ہوئے یہ اعتراف کیا ہے

کہ یہ ادارہ ملت اسلامیہ کیلئے ایک قابل فخر میراث بن چکا ہے وہیں یہ بھی کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ڈونیشن جیسی علت وہاں بھی رائج ہے۔وہ لکھتے ہیں ’’انجمن اسلام کے بعض اسکولوں میں داخلے ڈونیشن کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔یہ نظام پسندیدہ نہیں۔اس میں سرمایہ داروں کے لڑکے داخل ہوجاتے ہیں اور جن کے پاس پیسہ نہیں وہ تعلیم سے محروم ہوجاتے ہیں یا اچھے اسکولوں میں انہیں داخلے نہیں مل پاتے۔اس طرح غریب ومتوسط درجے کے وہ طلباء جن میں ذہانت اور بھرپور صلاحیت ہوتی ہے وہ اپنے والدین کی معاشی کمزوریوں کی وجہ سے اچھی تعلیم سے محروم ہوجاتے ہیں۔‘‘ ڈاکٹر صاحب ایک علمی شخصیت ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی۔ملک میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب ریلوے اسٹیشنوں پر ہندو پانی اور مسلم پانی کے بورڈ آویزاں ہوا کرتے تھےجس سیہندوو?ں اور مسلمانوں کے درمیان حد درجہ منافرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔آج وہ بورڈ تو نہیں لیکن ان کے مابین منافرت اپنی انتہا پر پہنچ چکی ہے۔لیکن ضرورت کبھی کبھی مسلک ومذہب سے پرے ہٹ کر سوچنے پر مجبور کردیتی ہےجو ہمیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ

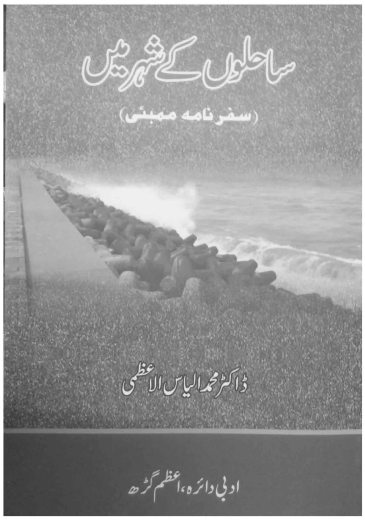

ہم نے جھوٹی انا کے دباؤ میں انسانی احترام تک ترک کر دیا ہیاور پھر بڑی عیاری کے ساتھ اسے مذہب سے جوڑ دیتے ہیں حالانکہ کوئی مذہب منافرت نہیں سکھاتا۔ ایک اقتباس دیکھیں۔ ''مغل سرائے اسٹیشن پر ہمارے سامان کے ساتھ پانی کی ایک بوتل بھی تھی۔ایک انجانے پیاسے شخص نے اسے اٹھایا اور منھ سے لگالیا میں جب تک اسے منع کرتا تب تک وہ پانی پی چکا تھا۔جب میں نے اسے بتایا کہ یہ میری جوٹھی بوتل تھی تو اس کو کسی قسم کی ناگواری نہیں ہوئی اور وہ مسکرا کر رہ گیا۔میں سوچنے لگا کہ عام حالات میں یہ شخص اس کپ میں چائے نہیں پی سکتا جس میں کسی مسلمان نے چائے پی ہو،مگر پیاس کی شدت میں یہاں اسے کوئی تردد نہیں ہوا۔''

سفر کے دوران انہوں نے مختلف اہم مقامات کی سیر کے علاوہ متعدد علمی و ادبی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں جن میں پروفیسر خورشید نعمانی، ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا، شمیم طارق، ڈاکٹر یونس اگاسکر، افتخار امام صدیقی، ہارون اعظمی، اشتیاق سعید وغیرہم قابل ذکر ہیں، اسی طرح اردو زبان و ادب کی مختلف النوع سرگرمیوں کا بھی اچھا خاصا احوال بیان کر دیا ہے۔ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش میں کامیاب ہیں۔اس بنیاد پر قارئین سے مطالعے کی سفارش کی جاسکتی ہے۔

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی و ناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔موبائل: 9392533661

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S. India